احمد ندیم قاسمی

# میرے ہمسفر

# میرے ہم سفر

# میرے ہم سفر

(سوانحی خاکے)

احمد ندیم قاسمی

ساقی بک ڈپو، دہلی

Mere Humsafar
-Ahmed Nadeem Quasmi

ISBN 81-85772-39-8

کتاب : میرے ہم سفر (سوانحی خاکے)

اہتمام : منصورہ احمد (اساطیر)

سرورق : شاہنواز زیدی

کمپوزنگ : طارق محمود کمپوزنگ سنٹر

مطبع : فائن آفسیٹ پریس، دہلی

سنہ اشاعت : ۲۰۰۳ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

ناشر

ساقی بک ڈپو

4157-A اردو بازار، دہلی۔110006

SAQI BOOK DEPOT

4157A, URDU BAZAR, DELHI-110006

منصورہ بیٹی کے نام

جو ان تحریروں کی محرک بھی ہے
اور انسپیریشن بھی

# کہکشاں


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | مولانا عبدالمجید سالک | ۱۷ |
| ۲۔ | مولانا غلام رسول مہر | ۳۱ |
| ۳۔ | مولانا چراغ حسن حسرت | ۳۸ |
| ۴۔ | سعادت حسن منٹو | ۴۸ |
| ۵۔ | ن۔م۔ راشد | ۸۹ |
| ۶۔ | فیض احمد فیض | ۱۰۶ |
| ۷۔ | سید ضمیر جعفری | ۱۵۵ |
| ۸۔ | امتیاز علی تاج | ۱۶۴ |
| ۹۔ | حکیم محمد سعید | ۱۷۴ |
| ۱۰۔ | خدیجہ مستور | ۱۸۰ |
| ۱۱۔ | ابنِ انشا | ۱۹۲ |
| ۱۲۔ | سجاد سرور نیازی | ۲۰۱ |
| ۱۳۔ | محمد طفیل | ۲۰۸ |

# سرِ آغاز

بہت مدت تک مجھے اس محبت بھرے مطالبے کا سامنا رہا کہ میں اپنے سوانح لکھوں۔ دراصل میرے طبقے کے ہر فرد کی طرح میری زندگی بھی نشیب و فراز سے اٹی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مفصل بیان نہ صرف دلچسپ ہوتا بلکہ تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے بعد بیشتر سیاست دانوں کی سیاست بازیوں اور پھر ہماری افواج کے بعض سربراہوں کی یلغاروں کی تاریخ بھی مرتب ہو جاتی کہ مجھے انفرادی اور اجتماعی سطح پر سچ بولنا بھی آتا ہے۔ افسوس کہ میرے معمولاتِ حیات میں سے اس کام کے لیے وقت ہی نہ نکل سکا۔ میں نے ایک بار اپنے حالاتِ زندگی کے نوٹ لینا شروع کیے تو میرے بچپن کے ابتدائی نو دس برسوں کی یادیں بھی ایک سو صفحات پر محیط ہوتی محسوس ہوئیں۔ یوں میں اپنی خودنوشت تحریر کرنے کے ارادے سے دستکش ہو گیا۔

اس دوران میری بیٹی منصورہ احمد نے ایک قابلِ عمل تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ آپ نے اپنی طویل زندگی میں علم و ادب اور شعر و فن کی اہم شخصیات کے ساتھ خاصا طویل وقت گزارا ہے۔ جب آپ ان شخصیات سے متعلق اپنی یادوں کو سمیٹیں گے تو بالواسطہ طور پر خود اپنے سوانح کے بعض حصوں کا بھی ذکر

کرتے چلے جائیں گے اور یوں عصر حاضر کے ادب کو دوگونہ فوائد حاصل ہوں گے۔ بیٹی کی یہ تجویز میرے دل کو لگی۔ پھر اس سے قبل میں رسالہ ''نقوش'' کے 'شخصیات نمبر' میں اپنے محسن مولانا عبدالمجید سالک اور اپنی بہن ہاجرہ مسرور کے خاکے لکھ چکا تھا' چنانچہ میں نے اس نتیجہ خیز تجویز کو عملی صورت دینے کا تہیہ کر لیا۔

میں نے اپنے پیارے اور محترم دوست سعادت حسن منٹو کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا جو حیرت انگیز اور مسرت بخش حد تک مقبول ہوا۔ اس کے بعد میں نے ن۔م۔راشد' فیض احمد فیض' سید امتیاز علی تاج' سید ضمیر جعفری' ابن انشا' خدیجہ مستور' محمد طفیل اور سجاد سرور نیازی کی شخصیتوں کو سمیٹا۔ مجھے مولانا غلام رسول مہر' مولانا چراغ حسن حسرت اور حکیم محمد سعید کا بھی کسی حد تک قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ ان کے بارے میں بھی اپنے تاثرات سپرد قلم کیے اور یوں میں تیرہ اہم شخصیات کے یہ خاکے ''میرے ہمسفر'' کی صورت میں یک جا کرنے میں کامیاب ہوا۔

اس سلسلے کی دوسری جلد ایسی ہی مشہور و مقبول شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہوگی۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے اور میں نے ان میں سے بیشتر کے بارے میں اپنی یادیں تحریر بھی کر رکھی ہیں۔ یہ مجموعہ بھی انشاء اللہ جلد شائع ہو جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی

# میری رائے میں ----

ایک عرصے سے مجھ پر دباؤ تھا کہ میں بابا کو اپنی خودنوشت سوانح لکھنے پر قائل کروں۔ یہ مطالبہ محبت کا تھا مگر اسے سبوتاژ بھی محبت نے ہی کیا۔ اس سلسلے میں جو بہت سا وقت اور توجہ کا ارتکاز درکار تھا وہ ہزار منصوبہ سازیوں کے باوجود کبھی میسر نہ آ سکا۔ تقریباً تین چوتھائی صدی پر پھیلا ہوا یادوں کا تسلسل ہمیشہ ملاقاتیوں کے ہجوم' فلیپ' دیباچوں اور صدارتوں کے دباؤ سے شکست کھا جاتا۔ سب خودنوشت کی اہمیت تسلیم کرتے تھے مگر اپنی اپنی کتاب کے فلیپ' دیباچے اور صدارتی خطبے کے بعد ---- نتیجتاً دو برس کی ناکام جدوجہد کے بعد ہم نے ہار مان لی اور اپنی شکستِ فاش کا اعلان بھی کر دیا۔ اس کے بعد مختلف مشورے ملے۔ مثلاً یہ کہ میں بابا کی بتائی ہوئی خاص اہم باتیں لکھ لیا کروں۔ یہ مشورہ میری افتادِ طبع اور مصروفیات کے سبب ناقابلِ عمل تھا۔ اپنے پبلشنگ ادارے اساطیر کے انتظام و انصرام' 'فنون' کی ادارتی مصروفیات اور ایک بھرے خاندان کی ذمہ داریوں کے بعد اتنا وقت کہاں بچ پاتا کہ میں نوٹس لے سکوں۔ پھر ایک اہم مسئلہ میرے اور بابا کے انداز بیان کا فرق بھی تھا۔ لہٰذا یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھی۔ اس کے بعد ایک اور کوشش کی گئی (بہت سے لوگوں کی مشاورت کے بعد) کیسٹ پلیئر اور خالی

کیسٹیں خریدی گئیں تاکہ گفتگو کو ریکارڈ کیا جا سکے اور پھر ہم میں سے کوئی اسے کاغذ پر منتقل کر لے۔ بابا نے اس خیال سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ اُن کا لکھنے کا اپنا ایک انداز ہے جس کے لیے ٹیپ ریکارڈر بالکل مددگار نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک بار خفیہ طور پر کیسٹ ریکارڈنگ آن کی لیکن عین وقت پر بابا کو پتا چل گیا اور منصوبہ ناکام ہو گیا۔

ایک روز بابا منٹو کے حوالے سے اپنا کوئی تجربہ بیان کر رہے تھے کہ مجھے ایک خیال سوجھا کہ خودنوشت کا خیال تو خیالِ خام ہی ثابت ہوا' کیوں نہ ان مشاہیر کے حوالے سے بابا اپنی یادداشتیں قلم بند کر لیں۔ یہ بھی ایک انداز سے جزوی خودنوشت ہی ہوگی---- خیال بابا کے سامنے رکھا تو انھیں پسند آیا۔ لیکن اسے عملی شکل دینے کے لیے مجھے ساڑھے چار برس یاددہانیاں کرانی پڑیں۔ کبھی بابا کی مصروفیات حائل ہو جاتیں اور کبھی ان کے دلِ نادان کی بغاوتیں جو سانس کی ناہمواری کے ساتھ مل کر تو حشر ہی برپا کر دیتیں۔ بہرحال صحت کے وقفوں میں جو کچھ میں لکھوا سکی آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

یہ ایک بڑے آدمی کی رائے ہے دوسرے بڑے آدمیوں کے بارے میں۔ اختلاف کا حق یقیناً ہمارے پاس ہے مگر اختلاف کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ کتاب میں ایسے مقام بھی آئیں گے جن سے آپ کو اختلاف ہو لیکن برائے مہربانی یہ ضرور ذہن میں رکھیے گا کہ علمی متانت اور شائستگی سے کیا گیا اختلاف جذباتی ہاؤ ہُو سے زیادہ خوبصورت اور پائیدار ہوتا ہے۔ گذشتہ دنوں 'معاصر' میں فیض صاحب کے بارے میں بابا کا وہ مضمون چھپا جو اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس پر جو ردِعمل دیکھنے اور سننے میں آیا اُس کے جواب میں ایک ردِعمل میرا بھی تھا جو اگلے 'معاصر' میں شائع ہوا۔ وہ اس لیے یہاں درج کر رہی ہوں کہ وہ تمام سوانحی خاکوں پر میرے نظریے کا ترجمان بھی ہے اور اس خصوصی

مضمون پر اٹھنے والے چند اعتراضات کا ایسا جواب بھی جو کبھی سوانحی خاکوں پر منطبق ہو سکتا ہے۔

''میں نے مرتے میں ایک سوانحی خاکہ چھپا . . . اور ترقی پسندی کے دائرے ایک محدود سے حلقے میں بھونچال آ گیا مگر کیوں؟ حالانکہ خاکہ لکھنے والا بھی ترقی پسند، موضوعِ مضمون بھی ترقی پسند اور بھونچال زدہ احباب بھی ترقی پسند۔ ترقی پسندوں نے بہت بلند آہنگی سے انسان کی آزادیِ رائے کا حق مانگا تھا، پھر خود ہی اس پر شب خون مارنے بیٹھ گئے۔ انصاف کا تقاضا جب گھر کی دہلیز تک پہنچے تو پلڑا اکثر ڈول جاتا ہے۔ دیکھیے ایسے سوانحی خاکوں میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلی تجربہ اور دوسری رائے۔ کیا آپ ان دونوں میں سے کسی کو چیلنج کر سکتے ہیں؟ کیا آپ ہدایت نامہ جاری کر سکتے ہیں کہ نہیں قاسمی صاحب! آپ فلاں کے بارے میں یہ رائے نہ لکھیے۔ آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیار اس رائے سے اختلاف کا ہوتا ہے یا اتفاق کا۔ بابا نے فیض صاحب کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ ہم آپ کون ہوتے ہیں ان کے درمیان آنے والے۔ ان کا اپنا ایک vintage po.nt ہے جہاں سے وہ فیض صاحب کو دیکھتے ہیں۔ ایک ہم عصر کے طور پر ان کا تجزیہ کرتے ہیں، اس میں بحث کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ پھر ہمارے پاس کون سی کسوٹی ہے جس پر ہم بابا کے تجربات کو جھٹلائیں۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی شخص سے دس لوگوں کو مختلف تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے پاس کوئی پیمانہ ہے جس کی مدد سے ہم پانچ لوگوں کی تردید اور پانچ کی تائید کریں؟ تو پھر یہ احباب صاحبِ مضمون کو اپنی رائے کے اظہار کے بنیادی حق سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں؟ یہ تو وہی zero tolerance ہے جس کی شکایت یہ لوگ مولوی سے کرتے رہے ہیں کہ ہر وہ رائے غلط ہے جو ان کی مرضی کے مطابق نہیں۔ عمر اور تجربے کی جس منزل پر یہ لوگ ہیں وہاں یہ رویہ بہت ہی بچگانہ ہے کہ جس کا

جو ہمیں پسند نہیں اس کا گلا گھونٹ دو۔ اس طرح تو بہت جمود اور سناٹا ہو جائے گا۔ صاحب! حسن و نمو ان کا مجموعہ ہے، اسی سے نغمگی ہے۔

میں نے ان تمام احباب کی تحریریں ایک سے زیادہ بار پڑھی ہیں اور ایک سے زیادہ بار ہی حیرت میں مبتلا ہوئی ہوں۔ ان تمام تحریروں کے مطالعے سے مجھ پر مندرجہ ذیل انکشافات ہوئے ہیں:

۱۔ پہلا انکشاف یہ ہوا کہ فیض احمد فیض ماورائے بشریت تھے۔ ان میں کوئی انسانی خامی ہونا ممکن ہی نہیں تھا، بلکہ جو خامی عام انسانی معیاروں سے سامنے آتی ہے وہ دراصل ہماری بصیرت اور بصارت کی خامی ہے۔ منٹو نے کیا خوب کہا تھا کہ مرنے کے بعد ہمارے ہاں عموماً لوگوں کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے، بلکہ ان لوگوں کے کالموں کا رویہ تو اس سے بھی آگے دیہات کے ان مریدوں کا سا ہے جن کا پیر وڈا سائیں ہر بشری کمزوری سے مبرا انسانِ کامل ہے۔ کیا فیض پیر وڈا سائیں کی سی بور شخصیت تھے؟ مجھے تو اس مضمون میں ان کی جیتی جاگتی ہنستی مسکراتی شخصیت ملتی ہے جو انسانِ کامل ہونے کی موربڈیٹی میں ہرگز مبتلا نہیں تھی۔ فیض صاحب عالم بالا میں اپنے موجودہ سٹیٹس سے سخت پریشان ہوں گے۔ اقتدار کی تنہائی سے بڑی تنہائی کون سی ہوتی ہے؟ پھر یہ بھی بتائیے کہ آخر اس مضمون میں فیض صاحب پر کون سی چوری، رسہ گیری اور اغوا کا الزام لگا ہے؟ کچھ نظریاتی فروگزاشتوں ہی کا گلہ ہے نا جو ایک نظریاتی اور آدرشی شاعر کے لیے تو بہت عزت کی بات ہے، کہ اس سے اتنی بلندی کی توقع کی گئی تو گلا پیدا ہوا۔ بابو نے فیض صاحب سے گلہ کر کے دراصل انھیں عظمت کا مان دیا ہے۔

۲۔ دوسری fallacy یہ ہے کہ فیض صاحب ہر الزام خاموشی سے سن لیتے تھے اس لیے وہ ایک عظیم صوفی تھے۔ حالانکہ ہر خاموشی صوفیانہ سرمستی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ہم بہت دفعہ اس لیے خاموش ہو جاتے ہیں کہ ہمارے پاس کہنے کے

لیے کچھ نہیں ہوتا' اور خاموشی ہی واحد گوشۂ عافیت بن جاتی ہے۔ مثلاً مجھے ایک حیرت ہے کہ ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں میں جب روسی ساخت کے طیارے میرے ہم وطنوں کی زندگیوں سے کھیل رہے تھے تو فیض صاحب اپنے ممدوح روس اور اس کے حلیف بھارت کی بہیمت کی مذمت میں ایک لفظ بھی کیوں نہیں بولے؟ ہم فاشزم کی مخالفت کے دعویدار دانشور کی اس خاموشی کو تصوف کے کس کھاتے میں ڈالیں؟ دوسری یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ فیض صاحب کی خاموشی کے معتقدین اس ضمن میں خود ان کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

۳۔ ایک دلچسپ fallacy یہ بھی سامنے آئی ہے کہ شراب پینا بُری بات نہیں' اس کا ذکر کرنا بُری بات ہے۔ یہ عجیب مضحکہ خیز تضاد ہے کہ یہ احباب شراب پیتے بھی ہیں اور اسے بُرا بھی سمجھتے ہیں۔ جبکہ اس سلسلے میں بابا کی پروچ بہت غیر جانبدار ہے۔ وہ کبھی اخلاقیات کے ٹھیکیدار نہیں بنے۔ ان کے بہت سے دوست پینے کے شائق ہیں لیکن ان کا یہ شوق کبھی ان کی اور بابا کی محبت پر اثر انداز نہیں ہوا۔ اب اسی مضمون کو دیکھیے۔ پورے مضمون میں شراب کے حوالے سے فیض صاحب کا Image بہت خوشگوار صورت میں اُبھرتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو بہت پینے کے بعد بھی لڑکھڑاتا نہیں' بدحواس نہیں ہوتا بلکہ زیادہ خوبصورت گفتگو کرنے لگتا ہے۔ اس صورتِ حال میں میرے بزرگوں کو اعتراض کیا ہے؟ میرا خیال ہے ان کا اعتراض بھی وہی ہے جو STN والوں نے گلزار صاحب کی ٹیلی فلم سیریل ''مرزا غالب'' پر کیا تھا کہ اس میں غالب کو شراب پیتے ہوئے کیوں دکھایا گیا ہے۔

۴۔ چوتھا دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ بابا نے فیض صاحب کے یوم وفات پر اپنی سالگرہ منائی۔ میرے مہربانوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ سالگرہ کا دعوت نامہ

# مولانا عبدالمجید سالک

شروع ہی میں بتا دوں کہ میں سالک صاحب کی شخصیت کو ان چند صفحات میں سمیٹنے سے قاصر رہوں گا۔ اس عجز کے اعتراف ہی میں خیریت کیونکہ جس شخصیت میں مشرق کا کلچر مجسم ہوگیا ہو اس کا کما حقہ احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں اور جس طرح ایشیائی کلچر کی ان گنت ایک سے ایک دلآویز اور موتیوں کی طرح جگمگاتی ہوئی پرتیں ہیں اسی طرح سالک صاحب کی شخصیت کے بھی بے شمار پہلو ہیں اور اگر میں ان سب کا ذکر کرنے بیٹھوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کر رہا ہوں۔

شعر و افسانہ کی دنیا میں میرے ذہن نے جو بھی موضوع سوچا ہے اس سے میں نے بہت کم شکست کھائی ہے۔ میں نے موضوع کو فنی تخلیق پر کبھی مسلط نہیں ہونے دیا بلکہ میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میں تخلیق کے دودھ میں موضوع کو کھانڈ کی طرح گھول دوں۔ مگر میں سالک صاحب کی شخصیت کا ایک ذرا سا پرتو پیش کرنے کے تصور ہی سے کانپ رہا ہوں۔ اس موضوع اور میرے تخلیقی جذبے کے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ اُفق تا اُفق کا نہیں، فراز نشیب کا فاصلہ ہے۔ آپ کہیں گے، یہ ندیم نہیں بول رہا ہے، ندیم کی بے پناہ

صاحب کی شخصیت سے بھی متعارف اور متاثر ہو چکا تھا)۔ قیام پاکستان کے بعد جب ترقی پسند ادب کی تحریک زوروں پر تھی اور بعض علما کا واحد وظیفۂ حیات یہ رہ گیا تھا کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کے خلاف نت نئے فتوے جاری کریں۔ پھر جب اس رو میں سالک صاحب کے اور میرے بعض مشترک احباب بھی بہہ گئے اور انہوں نے میرے نظریۂ فن سے اختلاف کی وجہ سے مجھے نئی نئی گالیوں سے بھی نوازا، اور جب خود سالک صاحب کے بیٹے اور میرے دوست مسٹر عبدالسلام خورشید کو بھی اس ادبی انجمن سے متعدد اختلافات پیدا ہوگئے جس کا میں سیکرٹری تھا، تو سالک صاحب نے علی الاعلان میرا یعنی انجمن ترقی پسند مصنفین کا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر تاثیر ان کے پرانے دوست اور میرے کرم فرما تھے۔ (میرے قطعات کے مجموعے کا مختصر سا مگر خوبصورت ابتدائیہ انہی نے لکھا تھا) مگر سالک صاحب نے صاف لفظوں میں انہیں غیرت دلائی کہ ماضی میں ترقی پسندوں کے ایک اہم رہنما ہونے کے باوجود آپ ان کی مخالفت کرتے بھلے نہیں لگتے۔ چنانچہ سالک صاحب سے میری عقیدت کا وہی عالم رہا۔ اس سارے سلسلۂ واقعات کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ حکومت نے مجھے چھ مہینے کے لیے تدارکی نظر بندی کے تحت جیل بھیج دیا اور سالک صاحب "انقلاب" کے بند ہو جانے کے بعد کسی سرکاری محکمے سے منسلک ہوگئے۔ لیکن جب میں رہا ہوا تو سب سے پہلے جس شخص نے میرے گھر آ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا وہ سالک صاحب ہی تھے۔ پھر میں سالک صاحب کی طرح ایک روزنامے کا ایڈیٹر ہوا اور سالک صاحب میری طرح گھر میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہم مہینوں ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تھے لیکن اگر اس عالم میں بھی کوئی مجھے یہ بتاتا کہ سالک صاحب کچھ عرصے کے لیے لاہور سے باہر جا رہے ہیں تو میں اداس ہو جاتا اور میرے لیے لاہور ایک دم خالی ڈھنڈار ہو کر رہ جاتا۔

نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ سالک صاحب نے حکیم صاحب سے کہا ''آج کل تو جسے دیکھو آپ کے ہری چند اختر کو بانس پر اٹھائے پھرتا ہے۔''
حکیم صاحب نے لطیفے سے محظوظ ہونے میں دیر لگائی تو سالک صاحب نے بتایا کہ جھنڈا ہرا (ہری) ہے اور اس پر چاند (چند) ستارے (اختر) کا نشان ہے اور---- ''ظالم اب تو ہنس دو!''
اور میں اپنی آدھی بیماری وہیں کہیں راستے ہی میں جھٹک آیا۔
سالک صاحب کی محبوبیت' ان کا خلوص' ان کی فراخ دلی' وسیع المشربی اور نیک نیتی ان کی اسی مسکراہٹ میں سمٹ آئی اور یہی مسکراہٹ ان کا کردار تھا اور جب یہ مسکراہٹ لمحے بھر کے لیے غائب ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ان پر کوئی حادثہ گزر گیا ہے۔ ان ''حادثوں'' کی نوعیت کیا ہوتی تھی؟ اس کی ایک جھلک تو اوپر کے واقعے میں موجود ہے مگر ایک مثال اور بھی سُن لیجیے۔
آغا شورش کاشمیری نے یک بار ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے دفتر ''انقلاب'' پر ہلہ بول دیا اور انقلاب کے دفتر اور پریس میں کچھ دیر تک توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ چند روز کے بعد حکومت نے شورش صاحب کو نظر بند کر دیا۔ جب سالک صاحب کو ان کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بولے ''یہ حکومت کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ شورش ذرا سا جذباتی ضرور ہے مگر جذباتیت پر تو غصے کے بجائے پیار آنا چاہیے۔ اور بدذوق حکومت کو شورش پر ہمیشہ غصہ ہی آتا ہے' پیار کبھی نہیں آیا۔''
پھر ایک بار جب شورش کاشمیری کو ایک مقدمے کا سامنا تھا اور عدالت نے ضمانت کے لیے ایک معتبر ضامن طلب کیا اور سالک صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو وہ فوراً عدالت میں پہنچے اور اُن شورش صاحب کی ضمانت دے دی جن کا جلوس اس سے پہلے سالک صاحب کے اخبار کے پریس کی مشینوں کو

اور پھر دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میرے عزیز دفتر ''انقلاب'' میں گئے اور دو تین گھنٹے تک واپس نہ آئے۔ میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ سالک صاحب دو تین گھنٹے پہلے کسی شخص کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد میرے عزیز واپس آئے اور معلوم ہوا کہ سالک صاحب نے ان سے بے انتہا ہمدردی کی۔ پہلے فون کیا لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ فون پر نہیں ٹرخانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ انہیں ساتھ لے کر متعلقہ افسر کے پاس پہنچے اور کام کرا کے اٹھے۔ جب واپس آنے لگے تو اس افسر نے سالک صاحب سے کہا ''کام تو میں نے کر دیا مگر قبلہ! مجھے یہ وہم بھی نہ تھا کہ آپ ایسے معاملات میں بھی دلچسپی لے سکتے ہیں۔'' اور سالک صاحب نے مسکرا کر کہا ''یہ تو ایک بزرگ کے مزار کا معاملہ تھا اور بعض لوگ تو میرے پاس اپنے محلّے کی مسجد کے لیے سستے داموں پر مٹی کے ڈھیلوں کا انتظام کرانے بھی آ نکلتے ہیں۔''

سالک صاحب کے پاس اس قسم کے ضرورت مندوں کا ہمیشہ تانتا لگا رہتا تھا اور جب وہ ایک حد تک گوشہ نشین بھی ہو گئے تو بھی ضرورت مند انہیں جا ہی لیتے تھے اور اگر ضرورت معقول ہوتی (یعنی مٹی کے ڈھیلوں کی سی ضرورت نہ ہوتی) تو حسب عادت ان کے ساتھ چل کھڑے ہوتے۔ بلکہ بعد میں انہوں نے موٹر کار بھی خرید لی تھی اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ تکلف بھی انہوں نے محض اس لیے کیا کہ لاہور سے ان کے پاس مسلم ٹاؤن آنے والوں کو واپسی میں تکلیف نہ ہو۔

''ضرورت مندوں'' کی ایک اور قسم کا بھی ان کے اردگرد ہمیشہ ہجوم رہا۔ یہ ادب و فن، شعر و نغمہ اور لطافت و جمال کے ''ضرورت مند'' تھے اور سالک صاحب کی انجمن آرائی ربع صدی کی علمی و ادبی دنیا کی ایک حقیقت بن چکی

کہ ذوق کے زمانے میں غالب بھی موجود ہے اور امیر مینائی کے زمانے میں حالی کی آواز بھی آ رہی ہے اور نوح ناروی کے وقت میں اقبال کا نغمہ بھی گونج رہا ہے۔ اور پھر یہ تو اب کی بات ہے۔ آج سے چار صدی پہلے فیضی وہی بات کہہ گیا ہے جسے تم لوگ قطعی نئی بات سمجھ کر اس پر اپنے فن کی تعمیریں اٹھا رہے ہو۔ دیکھو، فیضی کی یہ رباعی دسویں صدی ہجری کی پیداوار معلوم ہوتی ہے یا تمہاری چودھویں صدی ہجری کی:

ما عقل بہ صد جام لبا لب ندہیم
یک پرتو دل بہ سبعہ کواکب ندہیم
با ما ز فروغِ شب مہتاب مگو!
ما یک دم صبح را بہ صد شب ندہیم

ساتھ ہی جب سالک صاحب شگفتگی کے موڈ میں آ جاتے (آ جانے کا جھگڑا ہی نہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی سدا بہار تھی) تو پھر وقت پر بڑا غصہ آتا جو گزرا جا رہا تھا اور جب یہ محفل، جسے قیامت تک برپا رہنا چاہیے، منتشر ہو جائے گی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ سالک صاحب نے اپنے دفتر میں چھڑکاؤ کرا رکھا تھا، چقیں گرا رکھی تھیں اور چھوٹے سے کمرے میں گرمی کا نشان تک نہ تھا۔ محفل میں دو ہندو بزرگ بھی بیٹھے تھے اور بے تعصبی اور فراخ دلی کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں۔ سالک صاحب تاریخی حوالوں سے مسلمانوں کی بے تعصبی کا ذکر کر رہے تھے۔ اچانک چق اٹھی اور دو نوجوان طالب علم اندر آئے۔ آتے ہی انہوں نے اطمینان کی لمبی لمبی سانسیں لیں اور ان میں سے ایک بولا ''مولانا آپ نے تو اپنے دفتر کو بالکل جنت بنا رکھا ہے۔'' سالک صاحب نے فوراً کہا ''تشریف رکھیے۔ اب جنت بالکل مکمل ہو گئی ہے۔ صرف غلمان کی کمی تھی۔''

یہ دونوں اس ادارے میں اُس وقت سے کام کر رہے تھے جب شمس العلما مولوی ممتاز علی مرحوم کی زندگی میں سالک صاحب "پھول" اور "تہذیب" کے ایڈیٹر تھے۔ اس لیے سب ایک دوسرے کے پرانے مزاج داں تھے۔ سالک صاحب کمرے میں آتے ہی فرماتے "چپراسی سے کہو کہ دتی والے کی چاٹ کی چار پلیٹیں لے آئے۔" ہم چاٹ پر جھپٹتے تو سالک صاحب چپراسی سے کہتے "چار پلیٹیں قلفی کی بھی تو لے آؤ۔" پھر قلفی کی چار پلیٹوں کا صفایا کیا جاتا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتیں، اور سالک صاحب بل ادا کر کے مسلم ٹاؤن روانہ ہو جاتے۔ دو تین مہینے تک یہی سلسلہ جاری رہا تو میں نے اپنے خوشنویسوں سے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم سالک صاحب پر بوجھ بنے رہیں گے۔ وہ ہم پر ماہانہ کئی روپے خرچ کیے جا رہے ہیں اور یہاں اپنی تنخواہ ہی ستر پچھتر تھی۔ طے پایا کہ ہم تینوں اپنی اپنی تنخواہوں میں سے کچھ رقم نکال کر الگ رکھ لیا کریں اور چاٹ اور قلفی کے اخراجات کا نصف اپنے ذمے لے لیں۔ مجھ میں تو اتنی جرأت نہیں تھی کہ سالک صاحب پر اپنی "سازش" کا انکشاف کرتا۔ منشی تہور علی رام پور کے پٹھان تو تھے مگر "نہ بھئی ہم سے تو یہ نہ ہوگا" کہہ کر رہ گئے۔ البتہ موچی دروازے کے منشی فرزند علی نے ہماری ترجمانی کی ذمہ داری اٹھائی اور سالک صاحب کے تشریف لانے سے پہلے ہی ہم نے چاٹ اور قلفی والے کو پیشگی رقم ادا کر دی۔ سالک صاحب حسب معمول تشریف لائے۔ چاٹ اور قلفی کا آرڈر دیا اور جب رقم نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو منشی فرزند علی نے (جن کے گنج پر پسینے کے قطرے بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے تھے) اپنی تلخ ڈیوٹی ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں ادا کر دی اور سالک صاحب جیسے ایک دم سناٹے میں آ گئے۔ ہم تینوں کو باری باری گھورا اور بولے "تم لوگوں نے پچھلے تین مہینوں کی چاٹ کا نمک اور قلفی کی مٹھاس غائب کر دی ہے۔ ارے سرمایہ دارو! میں تم سے زیادہ کماتا ہوں اس

کہنا صرف یہ ہے کہ ایک بہت بڑی شخصیت جب اپنی عظمت کے باوجود ذرا سا نشیب میں آ کر ''بچوں'' کو بھی اپنی عظمت میں شریک کر لیتی ہے تو زندگی پر کتنا بہار آتا ہے۔ سالک صاحب مجسم عظمت تھے اور مجسم پیار اور ان کے ہزاروں شناساؤں میں سے اگر کسی کو اس سے شکایت تھی تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس نے سالک کو سمجھا ہی نہیں تھا اور پھر بعض لوگوں کا ''ذائقہ'' ہی خراب ہوتا ہے اور ان کا ذہن شہد میں بھی کونین کا مزا ڈھونڈ نکالتا ہے۔

لاہور کے ناشرین کا ایک وفد سالک صاحب کے پاس گیا کہ ان کی ایک تحریک میں وہ ان کی اخلاقی امداد کریں۔ سالک صاحب کو اس تحریک سے اختلاف تھا اس لیے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ دیا کہ ''میرے خیال میں آپ لوگ غلطی پر ہیں اس لیے آپ کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کی مخالفت ضرور کروں گا اور یہ مخالفت اصولی ہوگی۔'' جب سے میں نے بعض ناشرین کو سالک صاحب سے ایسی باتیں منسوب کرتے سنا ہے جو سالک صاحب کا جانی دشمن بھی ان سے منسوب نہیں کر سکتا (بشرطیکہ وہ سالک صاحب کو جانتا ہو) میں نے ان دوستوں میں سے ایک دو کو کہا کہ تمہیں سارے لاہور میں صرف سالک ہی اپنا مخالف نظر آیا۔ اس لیے کہ اس نے ریاکاری کے بجائے صداقت سے کام لیا اور اس کی اخلاقی جرأت نے (اور اخلاقی جرأت کی امید صرف بلند اخلاق انسان ہی سے کی جا سکتی ہے) تمہیں دھوکے میں نہیں رکھا ورنہ تمہیں لاہور میں تمہیں ایسے ''ہمدرد'' بھی ملے تھے جنہوں نے تمہارے ہاتھوں میں ہاتھ تھامنے کے بعد تمہاری کشتی میں چپکے سے چھید کر ڈالے۔ اور پھر خود تمہارے اندر بھی ایسی شخصیتیں موجود تھیں جنہوں نے تمہارے پاس جماعتی مفاد کا رونا رویا اور تنہائی میں جا کر اپنے ذاتی مفاد کی قربان گاہ پر اپنے ضمیر کی بھینٹ دے دی۔ سو یہ سب ''ذائقے'' کی باتیں ہیں! (یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ میں اپنی

# مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر کی رحلت کی صورت میں وہ خطہ ارض، جسے جنوبی ایشیا کہتے ہیں، دانشوری کی اس عظیم روایت کی روشن مشعل سے محروم ہوگیا ہے جس کا آغاز آج سے تیرہ صدی پہلے، اموی اور پھر عباسی عہد حکومت میں ہوا تھا۔ آج کے دور کا کوئی بھی دانشور اتنے ہمہ گیر علمی تبحر کو سنبھال ہی نہیں سکتا چنانچہ ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو صرف پاکستان ہی اپنے ایک عظیم اور قدآور فرزند سے محروم نہیں ہوا بلکہ اس پورے خطہ ارض پر علم و تہذیب کی قدیم روایات سر پیٹ کر رہ گئی ہیں۔ مولانا مہرؔ کی شخصیت جو علوم کے متعدد شعبوں پر اتنے پُراعتماد تبحر کے ساتھ حاوی ہو، اب کہیں ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتی۔ اب تو علمی تبحر کے بڑے بڑے دعویداروں کے عقب میں ذاتی چپقلش اور فروعی عداوتیں ننگا ناچ ناچتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہیں اور وقار و متانت کے بڑے چمک دار خولوں کے پیچھے منافقت کے نہایت گھناؤنے چہرے ہر راہ چلتے پر دانت کچکچاتے نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کا لاہور جن عظیم شخصیتوں کے وجود سے منور تھا ان میں سے آخری شخصیت بھی اٹھ گئی۔ لاہور کسی بھی دور میں ایسی شخصیتوں سے محروم نہیں رہا۔ مگر مولانا کی رخصت کے بعد فی الوقت اس افق پر کوئی ستارہ نظر نہیں آتا۔ یوں سمجھئے

صرف چند ذاتی تاثرات عرض کرنا ہیں۔ لاہور سے ایک روزنامے نے مولانا کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:

''آخری ایام میں وہ ایک حجرہ نشین درویش تھے اور انہوں نے اپنے حجرے کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھی تھیں۔''

ان کی ادارت ''انقلاب'' کا ذکر ہے اور یہ شاید ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔ میں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے لاہور آ گیا تھا اور اپنے محسن گرامی مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے توسط سے مولانا مہر سے تعارف حاصل ہوگیا تھا۔ میں قریب قریب روزانہ دفتر ''انقلاب'' میں حاضری دیتا تھا۔ ایک روز میں سالک صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ مولانا صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ ''اللہ مجھے معاف کرے آج بی۔اے کے اُردو پرچے دیکھتے ہوئے میں نے ایک امیدوار کو' جس کے جوابات کچھ ایسے معیاری نہیں تھے' محض اس لیے زیادہ سے زیادہ نمبر دے ڈالے کہ اس نے تمہارا (یعنی میرا) ایک اچھا شعر کسی سوال کے جواب کے دوران مناسب مقام پر درج کیا تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

تیری نظروں میں تو دیہات ہیں فردوس مگر
میں نے فردوس میں اجڑے ہوئے گھر دیکھے ہیں

میں نے عرض کیا کہ یہ شعر تو میرے افسانوں کے ایک مجموعے ''بگولے'' کے منظوم دیباچے کا ہے۔ حیران ہوکر پوچھا کہ کیا تم افسانے بھی لکھتے ہو؟ سالک صاحب نے میرے دیہاتی پس منظر کے افسانوں کی تعریف کی تو مولانا نے فرمایا کہ اس نوجوان کو اپنی تمام تر توجہ شاعری پر صرف کرنی چاہیے۔ پھر مجھ نوآموز کی شاعری کی بہت تعریف فرمائی۔ ظاہر ہے کہ میری بے حد ہمت افزائی ہوئی مگر دوسرے روز میں ان کی خدمت میں اپنے افسانوں کا متذکرہ مجموعہ پیش کر آیا۔ چند روز کے بعد ملاقات ہوئی تو پوچھا ''یہ کرشن چندر کون ہے؟'' کرشن نے میرے اس

تحسین نہیں کر سکیں گے اور غالب کے کلام کو استخوانی انگلیوں اور ہاتھ باتھ بجر کی گردنوں میں محبوس دیکھ کر پریشان ہوں گے۔ مگر جب ہم نمائش میں داخل ہوئے تو میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ مولانا مہر تو ایک ایک تصویر کے سامنے آدھ آدھ گھنٹہ رک کر اس کے حسن و بلاغت کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ بہت دیر کے بعد جب ہم اس نمائش سے نکلے تو مولانا اتنے متاثر تھے کہ فرمایا۔ ''آج ایک اور غالب سے ملاقات ہوئی۔ اس شاعر کی شخصیت کتنی پہلودار تھی اور صادقین نے غالب کی شخصیت کے اس پہلو کو' جو ہم سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا' کتنی خوبصورتی سے فن کی گرفت میں لیا ہے!''

یوں ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا نے گوشہ نشینی کے بعد اپنے حجرے کی تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ یہ وسیع القلبی بہت کم بزرگ دانشوروں کے حصے میں آئی ہے۔

ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں شعر شناسی کا فقدان ہے۔ حد یہ ہے کہ بعض معروف شعرا کو بھی اچھے شعر کا کم ہی پتا چلتا ہے۔ میں نے جن اکا دکا اصحاب کو شعر شناس پایا ہے' ان میں مولانا مہر کا درجہ بہت اونچا تھا۔ غالب کے تو خیر وہ عاشق تھے اور اس کے ایک ایک شعر کی ایسی ایسی پرتیں کھولتے چلے جاتے تھے کہ ان کے انداز تحسین پر حیرت ہوتی تھی۔ نظیری اور عرفی کے بہت قائل تھے۔ ایک بار عرفی کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے اس کے قصیدے تو پڑھے ہیں مگر اس کی غزلوں کا دیوان' ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔ فرمانے لگے ''میرے پاس ہے''۔ پھر دیوان مجھے تھما دیا۔ میں سمجھا مجھے پڑھنے کے لیے عنایت کر دیا ہے چنانچہ جب میں اٹھا تو یہ دیوان بھی ساتھ لیے آیا۔ تیسرے روز مجھے مولانا کا خط ملا کہ میاں! میں تو سمجھا تھا تم عرفی کو ایک دن کے لیے لے جا رہے ہو مگر دو روز ہو گئے' تم نے دیوان واپس نہیں کیا۔ میں اگر صبح کو عرفی کی ایک آدھ

پرانی وضع کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں، رنگ رنگ کی کتابوں کے میناروں میں گھرے ہوئے مولانا مسلسل ادب وفن کی غواصی میں مصروف ہوتے تھے اور جب میں (یا کوئی بھی اور) حاضر ہو کر سلام کرتا تھا تو وہ اتنی بے حدود محبت اور توجہ سے پیش آتے تھے جیسے وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ لاہور مولانا مہر کی سی ہمہ جہت شخصیتوں سے محروم ہو کر کتنا غریب ہو گیا ہے۔

***
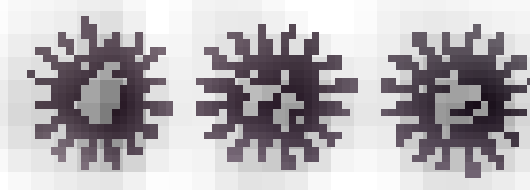
# مولانا چراغ حسن حسرت

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے بارے میں چند یادیں محفوظ ہیں جو بکھری ہوئی ہیں۔ اور یہ چند یادیں بظاہر کوئی ادبی یا علمی اہمیت نہیں رکھتیں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے ان پر فخر ہے۔ اس لیے کہ یہ یادیں ادب و صحافت کی ایک ایسی شخصیت سے متعلق ہیں جس کی عظمت اور ہمہ گیری ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

ان دنوں کی بات ہے جب میں حضرت مولانا سالک مرحوم کی خدمت میں نہایت باقاعدگی سے حاضر ہوتا تھا۔ میری قومی اور ملی نظمیں روزنامہ "انقلاب" میں شائع ہوتی تھیں اور اسی لیے سالک مرحوم حضرت حفیظ ہوشیارپوری کو اور مجھے "شاعر انقلاب" کہتے تھے۔ ان دنوں "انقلاب" کا دفتر میکلوڈ روڈ پر [illegible] میں تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ایسا اتفاق ضرور ہوتا تھا کہ میری موجودگی میں مولانا حسرت بھی مولانا سالک کے ہاں آ نکلتے۔ میں ان کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتا رہتا۔ کہتے ہیں کہ جب اپنے کاموں میں [illegible] رہتے مصروف اور [illegible] ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے انھیں ایک دوسرے کا [illegible] کی [illegible] نہ ہوگی۔ مگر یہ دونوں دوست بھی سگے بھائیوں کی طرح بھی معاملات

میں ایک دوسرے سے مشورے لے رہے ہیں۔ آج کے علمی ادبی اختلافات کو جب میں سالک وحسرت کی ان ملاقاتوں کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ ہم لوگ آپس میں بچوں کی طرح لڑتے اور انہی کی طرح ایک دوسرے سے کٹیاں کر لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سالک صاحب نے میرا تعارف حسرت صاحب سے یوں کرایا تھا کہ یہ مولانا غلام مرشد صاحب کے خالہ زاد بھائی ہیں اور ''انقلاب'' میں ان کی نظمیں باقاعدگی سے چھپتی رہتی ہیں اور حسرت صاحب نے فرمایا تھا۔ ''آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن انہوں نے اپنی داڑھی کہاں چھپا رکھی ہے۔''

ان ملاقاتوں میں میری حیثیت زیادہ تر ایک خاموش سامع کی تھی۔ اول تو میرے پاس ادب وصحافت کے ان دیووں کے سامنے بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر دونوں حضرات خاص طور سے حسرت صاحب کچھ ایسے نستعلیق لہجے میں اُردو بولتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا سیدھے لکھنؤ سے آ رہے ہیں۔ ایک روز سالک صاحب نے دفتر سے اٹھتے ہوئے فرمایا کہ چلو آج تمہیں ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) کے پاس لے جائیں۔ میں علامہ اقبال سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر شاعری میں نو آموز تھا اور پھر ابھی تک میں وہ فقرہ ہی مکمل نہیں کر سکا تھا جو مجھے ان سے تعارف کے بعد ادا کرنا تھا۔ سالک صاحب کی شخصیت کا سہارا لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونا میرے لیے بہت آسان تھا اس لیے ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دل محمد روڈ پر ایک گلی میں ''شیرازہ'' کے دفتر میں تشریف لے گئے اور حسرت صاحب کو ساتھ لے کر جب سڑک پر آئے تو ادھر سے اختر شیرانی مرحوم ایک تانگے میں سوار جا رہے تھے۔ انہوں نے فوراً تانگا رکوایا۔ دونوں بزرگوں کو نہایت سعادت مندی سے سلام کیا اور ہماری منزلِ مقصود کا پوچھ کر کوچوان سے کہا کہ میو روڈ پر لے چلو۔ وہاں جاوید منزل کے سامنے تانگہ رکوایا'

اتنے میں رخصت ہو کر چلے گئے۔ علامہ صاحب جاوید منزل کے سامنے والے لان میں پلنگ پر نیم دراز حقہ پی رہے تھے۔ سالک و حسرت کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بشاشت چمک اٹھی۔ دیر تک سالک صاحب سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔ پھر حسرت صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا "حسرت صاحب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" اور حسرت صاحب نے جواب دیا "میں آپ کے حقے کی خودی پر غور کر رہا ہوں۔" علامہ اقبال نے بے اختیار ہنستے ہوئے اپنے حقے کی نے پہلی بار حسرت صاحب کی طرف موڑی۔ اس کے بعد بھی دیر تک باتیں ہوتی رہیں مگر اپنے حقے کی خودی انہیں دیر تک گدگداتی رہی۔

حسرت صاحب کو ایک روز معلوم ہوا کہ جب سالک صاحب مری کو چلے جاتے ہیں تو "افکار و حوادث" کا کام ان کے احباب لکھتے ہیں اور ان کے احباب کی فہرست میں میرا نام بھی شامل ہے اور "انقلاب" میں اب تک میرے پندرہ بیس شذرے شائع ہو چکے ہیں۔ فوراً مجھے شذرات لکھنے کی دعوت دی اور میں نے صرف "قاف" کے نام سے اس بے مثال فکاہی ہفت روزے میں متعدد مضامین لکھے۔ ان میں سے اگر اب کوئی مضمون میری نظر سے گزرتا ہے تو مجھے ندامت ہوتی ہے کہ میں شرارت کے مارے کیا کیا جھک مارتا رہا اور حیرت ہوتی ہے کہ حسرت مرحوم میرے ہر مضمون کی کتنی تعریف کرتے تھے۔ دراصل وہ زبان و بیان کے نہایت اعلیٰ معیاروں کے پابند ہونے کے باوجود نئے لکھنے والوں کی نہایت فراخ دلی سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے بزرگان ادب اور مدیران جرائد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نوواردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسی سے تو نوواردان بساط ادب کے حوصلے میں [illegible] مولانا حسرت، مولانا محمد علی [illegible]

صلاح الدین احمد کا طرزِ عمل قطعی طور پر یکساں تھا۔

جنگ شروع ہونے کے بعد مولانا حسرت فوج میں چلے گئے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں شاید خبروں کے شعبوں سے متعلق ہوگئے۔ انہی دنوں دہلی ریڈیو نے جدید شعرا کے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، سیماب اکبر آبادی، روشن صدیقی، فیض احمد فیض، ن۔م۔راشد، میراجی اور اسرار الحق مجاز کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ اُن دنوں دہلی ریڈیو سے مولانا حسرت کے علاوہ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ن۔م۔راشد، میراجی، ممتاز مفتی، اوپندر ناتھ اشک اور حفیظ ہوشیار پوری وغیرہ بھی متعلق تھے۔ میں منٹو کا مہمان تھا اور منٹو نے اپنے سب ساتھیوں کی کوئی نہ کوئی چھیڑ بنا رکھی تھی۔ متذکرہ مشاعرے کے موقع پر انہی احباب میں سے کسی نے جل کر کہا کہ ''منٹو! تم ہمیں چھیڑنے میں بڑے تیز ہو۔ حسرت صاحب بھی یہیں ہیں، کبھی انہیں بھی چھیڑ کر دیکھو تو تمہیں مزہ آ جائے۔'' منٹو نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور حسرت صاحب کو چھیڑنے چلا۔ ہم میں سے بیشتر احباب اس کے ساتھ تھے۔ مولانا نے چائے سگرٹ سے تواضع کی اور رات کے مشاعرے کا ذکر چلا۔ مولانا حسرت جدید شاعری کو صرف فیض کی شاعری کی حد تک برداشت کرنے کو تیار تھے اس لیے کہنے لگے: ''ن۔م۔راشد سے کہہ دو ایک وقت آئے گا جب غزل کہنے کو اس کا جی چاہے گا مگر کہہ نہیں سکے گا۔ آگے آگے قافیے بھاگے جا رہے ہوں گے اور ان کے پیچھے راشد دوڑا جا رہا ہوگا۔'' منٹو نے کہا ''مگر حسرت صاحب! ایسی روایت پسندی بھی کیا جو قدامت پسندی بن کر رہ جائے۔ آخر نئے شاعروں کو علامہ اقبال سے آگے ہی تو جانا ہے۔'' منٹو کا یہ کہنا تھا کہ مولانا حسرت کے تیور بدلے اور انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری کے حق میں ایسی زوردار تقریر کی کہ ہم لوگ تو دہل کر رہ گئے۔ مگر منٹو کہاں ماننے والا تھا۔ وہ بیچ بیچ میں کہتا گیا

"جو حضرات غزل نہیں سننا چاہتے وہ کانوں میں اپنی انگلیاں دے لیں یا باہر تشریف لے جائیں۔" اس جھگڑے نے اتنا طول کھینچا کہ پورا ہوٹل حسرت صاحب اور منٹو صاحب کے مکالموں سے گونجنے لگا۔ منٹو نے انتہائی غصے میں کہا "مولانا آپ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر کوئی ایسا کیمیاوی عمل میرے ہاتھ لگ جائے جس کی مدد سے میں "فسانۂ آزاد" کے تمام روزمرے اور محاورے آپ کے دماغ سے نچوڑ لوں تو پتہ ہے کیا ہو؟ آپ ایک سیدھے سادے "ھاؤ" بن کر رہ جائیں۔" جواب میں مولانا گرجے "برخوردار! اگر یہی کیمیاوی عمل میرے ہاتھ لگ جائے جس کی مدد سے میں تمہارے اندر سے سومرسٹ ماہم کی سب کہانیوں کے چربے نکال لوں تو پتہ ہے کیا ہو؟ تم سیدھے علی گڑھ جا کر سیکنڈ ایئر میں داخلہ لے لو۔" ان مکالموں سے پوری محفل کشتِ زعفران بن گئی اور انہی قہقہوں کے دوران میرے کہنے پر منٹو اٹھا اور مولانا حسرت کے سینے سے چمٹ گیا اور مولانا مسکراتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ہاں بھئی اب دو ایک غزلیں ہو جائیں۔"

قیام پاکستان کے بعد جب "امروز" جاری ہوا اور ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کے ایک رہنما ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ترقی پسند مصنفین کے لتے لینے شروع کیے تو ایک روز میں کسی کام سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتفاق سے اسی وقت ڈاکٹر تاثیر بھی آ نکلے۔ مولانا نے فوراً کہا کہ بھئی یہ بہت اچھا ہوا ہے کہ آپ دونوں یہاں اکٹھا ہو گئے۔ آپ کی بحثوں نے تمام ادبی حلقوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ یہاں بیٹھ کر طے کر لیجیے کہ کون غلطی پر ہے۔ میری تو جان پر بن گئی کہ ڈاکٹر تاثیر بہرصورت میرے محترم تھے اور میں ان سے زبان لڑانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ گفتگو کے بادشاہ تھے اور میں بولنے سے پہلے بیشتر وقت تولنے میں گزار دینے والا۔ مگر ڈاکٹر تاثیر کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور وہ

اپنے مخصوص لہجے اور عالمانہ انداز میں اپنے دلائل دینے لگے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ آخر آپ بھی تو ایک ترقی پسند شاعر اور ادیب کہلا چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "ترقی پسند ادب کی مثال ایک چھاتے کی سی تھی جسے میں نے امپیریلزم کے آفتاب کی تمازت سے بچنے کے لیے لگا رکھا تھا۔ اب یہ آفتاب غروب ہو چکا ہے اس لیے میں نے بھی یہ چھاتا لپیٹ کر الگ رکھ دیا ہے۔" میں نے عرض کیا "مگر ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ آفتاب پوری طرح غروب ہو چکا ہے؟" بولے "جی ہاں" میں نے کہا "تو اس صورت میں میں آپ سے بحث سے رکتا ہوں۔" کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر تاثیر جانے لگے تو مولانا حسرت نے کہا "چھاتا نہ لگایئے مولانا ہیٹ ہی پہن لیا کیجیے" ڈاکٹر تاثیر بے حد ذہین آدمی تھے۔ مولانا کے مشورے کی نوک کی چبھن کو فوراً محسوس کر لیا اور مولانا کی قراقلی ٹوپی پر کوئی مزے کی پھبتی کس کر چلے گئے۔

میں "نقوش" کا مدیر تھا۔ میں نے کہیں سے سنا کہ مولانا حسرت نے ایک نئی غزل کہی ہے اور پشاور ریڈیو کے مشاعرے میں بھی غزل پڑھ بھی آئے ہیں۔ میں اپنے رسالے کے لیے یہ غزل لینے حاضر ہوا تو فرمایا "آپ نے ٹھیک سنا ہے میں نے غزل کہی تو ہے مگر مولانا اب غزل کہنے میں مزا نہیں رہا۔ اب تو یہ ایسے لوگ غزلیں کہنے لگے ہیں کہ اگر غزل کہنے کی بجائے آٹے دال کی دکان کھول لیتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔" پھر غزل لکھ دی اور اسے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا "آپ کو بھی تو کچھ ہو گیا ہے۔ آپ بھی تو اب "چلی مشین چلی" قسم کی نظمیں کہنے لگے ہیں۔" اور دوسرے دن انہوں نے "حرف و حکایت" کے کالم میں ایک فقرے کا آغاز یوں کیا "مولانا کی غزل سے احمد ندیم قاسمی کی "چلی مشین چلی" تک"

…۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین … کی انجمن کی دوسری …

کانفرنس منعقد کی تو مولانا مجلسِ استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کانفرنس میں انہوں نے جو خطبہ پڑھا وہ اُردو نثر کا ایک شہ پارہ ہے۔ لاہور کی علمی' ادبی اور تاریخی اہمیت کو اتنی خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ کم ہی لوگ واضح کر سکے ہیں۔ یہی خطبۂ استقبالیہ اس جھگڑے کا پس منظر بنا جو اُردو ادب کے ایک یادگار مناظرے کی صورت اختیار کر گیا۔ ڈاکٹر تاثیر اور ان کے کوئی درجن بھر شاعر دوست تھے جو روزنامہ ''مغربی پاکستان'' میں مولانا حسرت اور ان کے واسطے سے میاں افتخارالدین' فیض احمد فیض اور مجھ پر برستے تھے۔ اور اِدھر تنہا مولانا تھے جو ''امروز'' میں ''فتولوہار'' کے نام سے صرف چار پانچ اشعار لکھ کر مقابل کی دس دس نظموں کا نہایت بھرپور جواب دیتے تھے۔ نظموں کی یہ لڑائی جاری تھی جب میں ایک روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خلافِ معمول بے اعتنائی سے پیش آئے۔ فرمایا ''کہیے مولانا کیسے آنا ہوا؟'' عرض کیا ''قبلہ میں اب تک اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر وغیرہ سے آپ کی جو لڑائی ہو رہی ہے اس میں میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ میں نے شعر میں طنز و مزاح کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ مگر آج مجھے خیال آیا ہے کہ لڑائی طول کھینچ رہی ہے اور آپ تنہا ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس سلسلے میں میں بھی کچھ طبع آزمائی کروں۔'' یہ سنتے ہی ان کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ فرمایا ''مولانا! میں تو آپ ہی کی لڑائی لڑ رہا ہوں اور مجھے آپ لوگوں سے شکایت ہے کہ آپ نے اور فیض نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ بہرحال آپ اپنی مرضی سے آ نکلے ہیں تو مجھے خوشی ہوئی ہے اور میرے دل میں آپ کی قدر بڑھ گئی ہے۔ بیٹھ جایئے اور کچھ کہیے۔'' میں نے ''اورد'' کے تمام ہتھیار استعمال کر کے چند اشعار کہے تو فرمایا ''کوئی ایسی چیز کہیے جس میں بے ساختگی ہو جسے پڑھ کر یہ محسوس ہو کہ بات آپ کے دل میں سے نکلی ہے۔ کل کچھ کہہ کر لایئے گا۔'' میں دوسرے دن ایک نظم لے گیا تو بہت پسند کی اور اس قسم

اگر میری ان منتشر اور سینکڑوں میں سے صرف چند یادوں سے مولانا حسرت مرحوم کی بوقلموں شخصیت کا کوئی ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے تو میں سمجھتا ہوں میں نے آپ کا وقت ضائع نہیں کیا۔ مجھے مولانا حسرت سے نہ تو دوستی کا دعویٰ ہے نہ ہم نشینی کا۔ ان کا میرا رشتہ صرف عقیدت مندی کا ہے اور عقیدت بے لاگ ہو کر کچھ کہنا چاہے تو یہی کچھ کہہ سکتی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔

❁❁❁
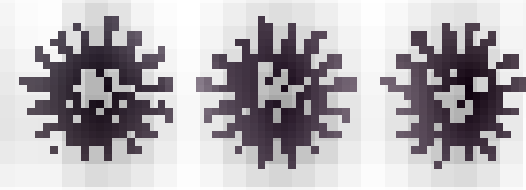
# سعادت حسن منٹو

منٹو کے مزاج و کردار کے بارے میں اکثر لوگ شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جبکہ میں نے خود بہت کم اتنے صاف ستھرے انسان کبھی دیکھے ہیں۔ جب تک منٹو سے میری ملاقات نہیں ہوئی وہ مجھے خطوں میں لکھتا رہا کہ مجھ سے مل کر آپ مایوس ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایسی باتیں کیوں لکھتا ہے۔ پھر جب منٹو سے ملاقات ہوئی تو نہ صرف یہ کہ مجھے کسی قسم کی مایوسی نہیں ہوئی بلکہ مجھے اس کی شخصیت کے متعدد پہلو بہت پیارے لگے۔ اس میں اگر کوئی خامی تھی تو صرف یہ تھی کہ وہ شراب کا عادی تھا مگر یہ خامی ایسی تو نہیں تھی کہ مجھے اس سے مایوسی ہوتی۔ ہماری سیاست اور ادب کے بڑے بڑے زعما اس عادت میں مبتلا رہ چکے ہیں مگر ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسری خامی --- اور اسے خامی کہا جا سکتا ہے --- یہ تھی کہ اس کی انا کی دیوار بہت اونچی تھی۔ مگر یہ انانیت اس پر سجتی تھی کیونکہ وہ ایک بڑا تخلیق کار تھا۔ منٹو سے ملاقات کے بعد اس کی موت تک کے چودہ پندرہ برسوں میں اس کی شخصیت کے ایسے ایسے خوشگوار پہلو میرے سامنے آئے کہ اس کے مزاج و کردار کے بارے میں تہمت کا اظہار کرنے والوں پر مجھے رحم آتا ہے۔

میں نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کے صاف ستھرے کرتے پاجامے میں دیکھا۔ سرما میں وہ سوٹ بھی استعمال کر لیتا تھا۔ وہ اعلیٰ معیار کے کاغذ پر افسانہ لکھتا تھا اور ہر افسانے کا آغاز ۷۸۶ کے ہندسوں سے کرتا تھا۔ کہتا تھا' یہ اللہ تعالیٰ کا ٹیلی فون نمبر ہے! اس کے سامنے درجن بھر ترشی ترشائی پنسلیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی کہ ایک دم اتنی بہت سی پنسلیں کیوں؟ منٹو نے مجھے بتایا" لکھتے لکھتے جب پنسل کی نوک موٹی ہو جائے تو اسے تراشنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور سلسلۂ خیال بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ سو گھسی ہوئی پنسل ایک طرف رکھ کر میں دوسری پنسل اٹھا لیتا ہوں۔"

میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کوتاہ ہوں۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے جب منٹو نے بمبئی کے ایک فلم پروڈیوسر شیراز سیٹھ سے میرا ذکر کیا اور مجھے اس کی آنے والی فلم "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گانے لکھنے کو کہا۔ اس طرح منٹو نے ایک ضرورت مند دوست کی مدد کی۔ خود اسے اس کام میں کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کوئی فائدہ اسے ہوا تو اس کا یہ اطمینان تھا کہ اس سے ایک دوست کی چند ضروریات آسانی سے پوری ہو جائیں گی۔ "دھرم پتنی" کا مصنف ایک مرہٹہ ادیب "کھانڈے کر" تھا۔ میں اُن دنوں ملتان میں ایکسائز سب انسپکٹر تھا۔ منٹو بمبئی میں ایک فلمی ہفت روزہ "مصوّر" کا ایڈیٹر تھا۔ اس ہفت روزہ میں وہ میری غزلیں اور نظمیں ایک آرٹسٹ "فیض" سے باقاعدہ مصور کرا کے اور بہت نمایاں کر کے چھاپتا تھا۔ وہاں امرتسر کے آغا خلش کاشمیری اس کے معاون کار تھے۔ اُن دنوں مشہور موسیقار رفیق غزنوی کے ساتھ منٹو کے گہرے مراسم تھے۔ وہ خطوں میں مجھے مطلع کرتا تھا کہ رفیق تمہارے فلاں کلام کی تعریف کر رہا تھا۔ ایک بار منٹو نے مجھے گلبرٹ کا ایک آپرا بھیجا کہ اس کا منظوم اُردو ترجمہ کر دو۔ یہ بمبئی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوگا اور اس کا ہدایت کار رفیق

غزنوی ہوگا۔ میں نے یہ آپرا لکھا۔ منٹو نے اسے بے حساب پسند کیا۔ رفیق
غزنوی نے اس کی دھنیں بنائیں اور اسے نشر بھی کیا۔ مجھے اس کا معاوضہ بھی ملا۔ بعد
میں یہ آپرا "ادب لطیف" میں شائع بھی ہوا۔ شاید اس وقت "ادب لطیف"
کے مدیر میرے محترم دوست راجندر سنگھ بیدی تھے۔

منٹو نے لکھا کہ وہ بمبئی سے دہلی آئے گا۔ مجھے مشورہ دیا کہ میں
ملتان سے دہلی پہنچوں۔ اس نے مجھے لکھا کہ وہ دہلی کے چاوڑی بازار میں
کسی دوسرے گروپ کی ملکیت روزنامے کے دفتر میں میرا انتظار کرے گا۔ میرا تانگہ
جب دہلی کے چاوڑی بازار میں داخل ہوا تو ہر دروازے اور ہر دریچے میں مجھے
عورتیں بن سنور کر یا بناؤ میں سجی سنوری نظر آئیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے
کوچوان سے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ وہ سمجھا کہ میں جو پنجابی شلوار و شیروانی میں
ملبوس تھا' ایک بڑا زمیندار ہوں اور بسلسلہ عیاشی دہلی آیا ہوں ورنہ ریلوے سٹیشن
سے سیدھے طوائفوں کے بازار چاوڑی کا رخ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔
کوچوان نے جواب میں صرف مسکرا دینا کافی سمجھا۔ آخر میں نے کرید کر اسے
ہفت روزہ کا بورڈ دکھا لیا۔ اترا اور دفتر میں داخل ہوا تو میں نے منٹو کو فوراً پہچان
لیا۔ مجھے دیکھتے ہی گورا چٹا' دبلا پتلا' بڑی بڑی اور ذہین آنکھوں والا صاف
ستھرے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس نوجوان میری طرف بڑھا۔ ہم نے معانقہ
کیا اور یوں گفتگو شروع کی جیسے ہم ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔
تصویروں کے ذریعے تو پہلے ہی ہم نے ایک دوسرے کو "دیکھ" بھی لیا تھا اور
خط و کتابت کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے۔ شام سے پہلے
ہمیں نئی دہلی کے ایک اعلیٰ درجے کے سینما ہاؤس کی بالائی منزل پر منتقل کر دیا
گیا۔ وہاں تین کمرے ہماری تحویل میں تھے۔ میں ایک کمرے میں منٹو کے ساتھ
رہتا تھا۔ ناشتے اور کھانے وغیرہ کا انتظام تسلی بخش تھا۔ وہیں میں نے دیکھا کہ

منٹو وہسکی پیتا ہے مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اتنی نہیں پیتا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ وہ تازہ دم ہونے کے لیے وہسکی کے ایک پیگ سے وہی کام لیتا تھا جو میں چائے کی ایک پیالی سے لیتا تھا۔ میں نے دس بارہ روز کے قیام کے دوران میں اسے کبھی ''آؤٹ'' نہیں دیکھا بلکہ اس حالت میں اس کی ذہانت دوچند ہو جاتی تھی اور وہ بعض ادیبوں اور شاعروں کے اندازِ گفتگو کی نقلیں خوب اتارتا تھا۔ انہی دنوں سینما ہال کے ''بار'' میں عاشق حسین بٹالوی سے ملاقات ہوئی تو منٹو ان کی آواز اور ان کے انداز کی ایسی ہو بہو نقل کرنے لگا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔

میں مکالمے اور گانے لکھنے میں اور وہ میرے مکالمے اور گانے ٹائپ کرنے اور بعض مقامات کی تصحیح میں مصروف تھا' جب منٹو نے ذرا سی تشویش کی حالت میں کہا کہ ''میں 'مصور' کے لیے ہفتۂ رواں کا میٹریل تو دے آیا تھا مگر اب میرے پاس نئے شمارے کے لیے 'اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم ''بال کی کھال'' لکھنے کا وقت ہی نہیں۔ کیوں نہ شاہد لطیف کو بلا لوں۔ وہ علی گڑھ میں موجود ہے اور میرا پرانا دوست ہے۔''

اُس وقت تک شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شاہد لطیف آیا۔ منٹو نے اسے ''مصور'' کا اداریہ اور کالم لکھنے کے لیے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ دو ایک گھنٹے کے بعد منٹو نے شاہد لطیف سے اس کے کام کی رفتار کا پوچھا تو وہ بولا ''یار منٹو!--- مجھ سے تو ابھی ایک سطر تک نہیں لکھی جا سکی۔ میں نے اس طرح کا کام کبھی نہیں کیا نا''۔ منٹو نے ناگواری سے اس کے سامنے سے کاغذات اٹھائے اور میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے دو ڈھائی گھنٹے کے اندر ''مصور'' کا اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم ''بال کی کھال'' لکھ کر منٹو کے حوالے کر دیئے تو منٹو نے اس کے

کر دیتا۔ کرشن یہ افسانہ پا کر بے حد خوش ہوا تھا۔ بعد میں منٹو کو کرشن سے لگاؤ تو یقیناً پیدا ہو گیا مگر اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں سے وہ راجندر سنگھ بیدی کو اپنے ذہن کے زیادہ قریب سمجھتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد منٹو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں سکرپٹ رائٹر مقرر ہو گیا اور بمبئی سے مستقلاً دہلی آ گیا۔ اس کے پاس ایک پورٹیبل اُردو ٹائپ رائٹر تھا۔ وہ اسے بریف کیس کی طرح اٹھائے پھرتا رہتا۔ ریڈیو سٹیشن پر لکھنے کی بجائے ٹائپ کرتا تھا۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن کا آئندہ ماہ کا پروگرام مرتب ہو رہا تھا جب منٹو سے پوچھا گیا کہ اس کے آئندہ ریڈیو ڈرامے کا عنوان کیا ہوگا۔ منٹو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا ''کبوتری'' لکھ لیجیے۔ بعد میں اس نے بتایا کہ محض عنوان کے حوالے سے اسے پورا ڈرامہ لکھنا پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اکثر یہی ہوا کہ عنوان پہلے دے دیا اور بعد میں اس عنوان کے گرد ڈرامے کی عمارت تعمیر کی۔

جب منٹو ریڈیو سے وابستہ ہوا تو کرشن چندر، راشدؔ اوپندر ناتھ اشک اور کئی دوسرے معروف شاعر اور ادیب ریڈیو سروس میں ملازم تھے۔ انھی دنوں منٹو اور کرشن چندر نے ایک فلمی کہانی ''بنجارا'' لکھی۔ اس کا سکرین پلے اور مکالے بھی مکمل کر لیے۔ مجھے ملتان سے اس کے گیت لکھنے کے لیے بلوا بھیجا۔ منٹو کا وہ چھوٹا سا مگر صاف ستھرا مکان مجھے اب تک یاد ہے۔ منٹو جس کمرے میں بیٹھ کر لکھتا تھا وہ مختصر تو تھا مگر انتہائی سادگی اور خوش ذوقی کا نمونہ تھا۔ منٹو میز کرسی کی بجائے فرش پر بیٹھ کر اور سامنے ایک ڈیسک رکھ کر لکھتا تھا۔ ڈیسک کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ اس میں وہسکی مقفل کر دیتا تھا۔ اُن دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کی چھوٹی سی پیاری سی بچی جب بھی ،موں ،موں پکارتی ہوئی آتی تو وہسکی کی بو فوراً سونگھ لیتی اور کہتی ''ماموں گندے ،موں

گندے۔'' منٹو جب اگر کوئی چیز اس کے حوالے کر کے کمرے سے نکال دیتا اور کہتا ''یہ لڑکی مجھے باجی کے سامنے شرمندہ کرائے گی!''

نجرا کے میوزک ڈائریکٹر فیروز نظامی تھے۔ وہ بھی ریڈیو سے متعلق تھے۔ انہوں نے میرے لکھے ہوئے گانے بہت پسند کیے۔ بہزاد لکھنوی بھی ریڈیو سے وابستہ تھے۔ جب انہوں نے میرے لکھے ہوئے گیت سنے اور منٹو نے بتایا کہ ندیمہ نے دو دنوں میں یہ دس خوبصورت گیت لکھ ڈالے ہیں تو بہزاد صاحب کو یقین نہیں آتا تھا۔ البتہ جب کرشن چندر نے تائید کی تو تب انہوں نے میرے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

اب منٹو، کرشن اور مجھے ''مدن موہن پکچرز'' کے مالک سیٹھ کے پاس جا کر یہ گیت سنانے تھے اور کہانی، مکالموں اور گیتوں کا معاوضہ کا چیک وصول کرنا تھا۔ ان دنوں روپے کی قیمت آج کے روپے سے ایک سو گنا زیادہ تھی چنانچہ ہمیں کہانی، مکالموں اور گانوں کے دو ہزار روپے ملے تھے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ منٹو نے مجھے سمجھایا کہ ''اگر سیٹھ کسی لفظ پر تمہیں ٹوکے تو فوراً مان جانا۔ تم شاعروں کی انا بہت تیز ہوتی ہے۔ اس سے بحث نہ کرنے لگنا ورنہ معاوضے کی رقم کھٹائی میں پڑ جائے گی۔ وہ جو بھی کہے، تم کہنا کہ آپ کا ارشاد بالکل درست ہے!''

سیٹھ نوجوان تھا مگر اس پر چربی اتنی افراط سے چڑھی ہوئی تھی کہ اس کی ٹھوڑی سے اس کے گھٹنوں تک ایک خاصا بڑا گنبد ابھرا ہوا تھا۔ میں نے گیت سنائے۔ اس نے پسند کیے مگر ایک لفظ پر اٹکا۔ بولا ''تمنا ومنا کو چھوڑو۔ یہاں آشا رکھو۔ تمنا کو سینما ہال کی چھوٹی کلاس والا نہیں سمجھے گا۔'' میں نے منٹو کے مشورے کے مطابق کہنا چاہا کہ آپ کا ارشاد درست ہے مگر مجھ سے پہلے منٹو بول پڑا۔ ''سیٹھ صاحب یہاں تمنا ہی ٹھیک ہے۔ جس چیز کا علم نہ ہو اس پر نہیں بولو۔

کرتے۔ یہ شاعری ہے' کھتونی نہیں ہے' آشا واشا نہیں چلے گا۔ تمنا ہی ٹھیک ہے اور اگر نہیں ٹھیک ہے تو ہمیں اجازت دیجیے۔" سیٹھ گھبرا گیا۔ بولا" تم بات بہت چیخ کر کرتا ہے منٹو۔ اور اتنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کرتا ہے کہ تم سے ڈر لگتا ہے۔ چلو تمنا ہی رہنے دو۔ آگے چلو۔" دو ہزار روپے کا بیئرر چیک لے کر ہم سیٹھ کے بنگلے سے نکلے تو منٹو نے اسے فوراً کیش کرانے کے عزم کا اظہار کیا۔ کرشن نے کہا کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ کل کیش کرالیں گے جبکہ ندیم کو ابھی تین چار روز کے بعد رخصت ہونا ہے۔ مگر منٹو بولا" تم فلمی سیٹھوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو۔ کیا پتہ وہ اپنی نیت بدل لے۔ ایک منٹ کی تاخیر کا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہیے۔ اور پھر مجھے ندیم کو اس گھیرے دار شلوار اور اس مولویانہ شیروانی سے بھی چھٹکارا دلانا ہے۔ ندیم کے حصے کی رقم سے اس کے لیے کوٹ پتلون کا کپڑا خرید کر فوراً ٹیلر ماسٹر کے حوالے کرنا ہے۔ یہ اتنی بھاری شلوار پھڑکاتا ہوا جب ہمارے ساتھ چلتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑا جاگیردار ہے اور ہم اس کے مزارعے ہیں!"

چاندنی چوک کے ایک بنک سے چیک کیش کرایا گیا۔ برابر برابر تقسیم کا مرحلہ آیا تو منٹو نے کہا کہ ہم مقامی ہیں اس لیے کرشن اور میں چھ سو ساٹھ' چھ سو ساٹھ لیں گے۔ ندیم ملتان سے آیا ہے اس لیے اس کے حصے میں چھ سو اسی روپے آئیں گے۔ پھر ہم تینوں کپڑے کی ایک دکان پر گئے۔ میرے لیے کوٹ پتلون کا کپڑا خریدا گیا۔ پھر یہ کپڑا درزی کے حوالے کیا گیا اور جب ہم منٹو کے گھر پہنچے تو وہاں سیٹھ صاحب کا منشی موجود تھا۔ وہ بولا" سیٹھ نے کہا ہے ہم نے فلم بنانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔ چیک واپس کر دیجیے۔ خبر ہے کہ جاپان بھی جنگ میں کود پڑا ہے اور اس نے پرل ہاربر پر امریکہ کے سمندری جہازوں کی ایسی تیسی پھیر دی ہے۔" تب منٹو نے فاتحانہ انداز سے ہم دونوں کی طرف

دیکھا۔ پھر سیٹھ کے منشی سے کہا ''سیٹھ سے کہو کہ اس کے چیک کی پرل ہاربر پر بھی حملہ ہو چکا ہے اور وہ کیش ہو کر خرچ بھی ہو چکا ہے----'' اور کرشن اور میں حیران ہوتے رہے کہ منٹو کس بلا کا دور اندیش ثابت ہوا ہے!

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جدید اُردو شعرا کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ایک یادگار مشاعرہ براڈ کاسٹ کیا۔ اس مشاعرے میں جو شعرا شامل تھے ان میں سے مجھے جن اصحاب کے نام یاد ہیں وہ یہ ہیں: فیض، راشد، میراجی، تاثیر، حفیظ جالندھری، تصدق حسین خالد، اسرار الحق مجاز، روش صدیقی۔ میں بھی مدعو تھا۔ میں نے اپنی ابتدائی نظم ''نیا ساز، نئی تان'' پڑھی۔ مشاعرے کے بعد منٹو جہاں بھی بیٹھتا تھا، یہی اعلان کرتا تھا کہ ندیم کی نظم سب سے بہتر تھی۔ یہ سب منٹو کی محبت کی کارفرمائی تھی۔

اس مشاعرے سے پہلے مدعو شعرا کے اعزاز میں بطرس بخاری مرحوم نے (جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے شاید ڈائریکٹر جنرل تھے) ریڈیو سٹیشن کے وسیع لان میں ایک ظہرانہ دیا۔ دہلی کے تمام قابلِ ذکر اہلِ قلم اور بے شمار امراء و رؤسا وہاں موجود تھے۔ ایک الگ میز پر منٹو، کرشن، میراجی، راشد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ میں بھی موجود تھا۔ اچانک منٹو نے حفیظ جالندھری کا ذکر چھیڑ دیا اور بولا: ''اسے اپنے بڑا ہونے کا بہت زعم ہے۔ میں اس کا یہ زعم توڑنا چاہتا ہوں۔ اس نے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے مجھے یوں مخاطب کیا ہے جیسے میں ابھی سکول کا بچہ ہوں اس نے مجھے ''منٹو صاحب'' کہنے کی بجائے کہا، ''کیسے ہو برخوردار سعادت''----یعنی میں ابوالاثر ہوں اور تم برخوردار ہو۔ ذرا دیکھنا میں اس کی کیسے خبر لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس مرکزی میز کے پاس گیا جہاں بخاری صاحب کے ساتھ حفیظ صاحب اور دیگر سینئر شعرا کے علاوہ دہلی کے شرفا بھی موجود تھے۔ وہ چھوٹتے ہی بولا ''حفیظ صاحب آپ کے ایک شعر نے مجھے

بہت دنوں سے پریشان کر رکھا ہے۔ اس میں اتنی گہرائیاں اور ساتھ ہی اتنی بلندیاں ہیں کہ میرا ذہن اس کے مفہوم کو گرفت میں لانے سے قاصر ہے۔ مجھے تو یہ فلسفیانہ شعر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہو تو مجھے اس کا مطلب سمجھا دیجئے۔" حفیظ صاحب منٹو کے اس اسلوبِ گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ بولے "ہاں برخوردار سعادت! بولو۔ وہ شعر کون سا ہے؟" اور منٹو بولا "شاہنامۂ اسلام کا شعر ہے مگر نہایت گمبھیر ہے۔ اور شعر یہ ہے:

یہ لڑکا جو کہ لیٹا ہے' وہ لڑکی جو کہ لیٹی ہے
یہ پیغمبر کا بیٹا ہے' وہ پیغمبر کی بیٹی ہے!

حفیظ صاحب فوراً منٹو کی نیت تک پہنچ گئے۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگے۔ بخاری صاحب نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کرایا اور منٹو ہمارے پاس واپس آ کر بولا: "برخوردار سعادت کا کمال دیکھا!"

اسی طرح ایک بار اسے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کی سوجھی۔ مولانا اُردو خبروں کے شعبے سے وابستہ تھے۔ منٹو' کرشن' میرا جی' دو ایک دوسرے اصحاب اور میں مولانا کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ہماری مدارات کی۔ چائے منگوائی' اور ہماری سعادت مندی کی تعریف کرنے لگے۔ تب منٹو نے انہیں چھیڑنے کے لیے مودبانہ عرض کیا۔ "حسرت صاحب! یہ جو علامہ اقبالؒ کی شاعری ہے' تو کیا یہ واقعی شاعری ہے؟ مجھے تو وعظ سا معلوم ہوتی ہے۔" بس پھر کیا تھا' حسرت صاحب نے منٹو کو اور ساتھ ہی ہم سب کو ایسی کھری کھری سنائیں اور علامہ اقبالؒ کی عظمتوں کا ایسا قصیدہ پڑھا کہ ہم ان کی مدارات کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ آئے۔

مولانا چراغ حسن حسرت اور منٹو کے درمیان مجھے ایک اور چپقلش یاد آ رہی ہے۔ فیض صاحب ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے طلبا کی ایک ٹیم کو علی گڑھ

تب میں نے حسرت صاحب کی منت کی کہ خدارا غصہ تھوک دیجیے۔ پھر منٹو سے عرض کیا کہ سارا ہوٹل آپ کی تیز دھار آواز سے گونج رہا ہے اور مہمان خصوصی فیض صاحب کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ اور پھر کچھ بھی ہو حسرت صاحب عمر میں تو آپ کے سینئر ہیں۔ تب میں دونوں کا معانقہ کرانے میں کامیاب ہو گیا اور قہقہوں کے درمیان یہ دعوت ختم ہوئی۔

ریڈیو سٹیشن پر بھی لوگ منٹو سے محبت کرتے تھے مگر وہ کسی کو چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ ایک بار ن۔م۔راشد سے کہنے لگا "تم جب کہتے ہو کہ اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے' تو کیا کبھی تم نے مغربی رقص کیا ہے؟ میں نے یہ ہے اس لیے آؤ۔ میرے ساتھ دو چار سٹیپس (Steps) رقص کرو۔ ابھی بھرم کھل جائے گا۔" کرشن چندر پر نظر پڑتی تھی تو کہتا تھا "یہ شخص ہر انسان کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ بھئی کسی کے ساتھ تو تھوڑی بہت کشیدگی بھی ہونی چاہیے۔ کرشن تم تو ادیبوں کے مہاتما بدھ ہو!" اوپندر ناتھ اشک پر جب بھی نظر پڑتی تھی منٹو پنجابی لہجے میں کہتا "اشکے اوئے اشکے!"---- ایک روز میں منٹو کے گھر میں اس کے پاس بیٹھا تھا جب اس دور کا ایک معروف شاعر وشوامتر عادل مجھ سے ملنے آیا' بولا "جب میں نے سنا کہ آپ دہلی آئے ہوئے ہیں اور منٹو کے ہاں ٹھہرے ہیں تو میں ایک لفظ کا تلفظ معلوم کرنے حاضر ہو گیا۔ یہ بتایئے کہ لفظ گنڈیری ہے یا ڈال پر تشدید ہے اور اسے گنڈّیری لکھنا چاہیے۔" منٹو نے پوچھا کہ یہ لفظ کہاں استعمال کرو گے عادل نے بتایا کہ یہ لفظ اس کی ایک نظم میں وارد ہو رہا ہے۔ عادل بھی شاید ریڈیو ہی سے وابستہ تھا اس لیے منٹو بے تکلفی سے بولا "احمق آدمی! جس نظم میں تم گنڈیری لاؤ گے' وہ بھی کوئی نظم ہو گی؟ تم شاعری کی بجائے گنڈیریوں کا خوانچہ کیوں نہیں لگا لیتے!"

میں ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا ریڈیو پشاور سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں میرا کام

وہی تھا جو دہلی ریڈیو میں منٹو انجام دیتا رہا تھا۔ قیامِ پاکستان سے کچھ پہلے یا کچھ بعد منٹو لاہور آ گیا تو مجھے لکھا کہ وہ ایک دوست کے ہمراہ پشاور آ رہا ہے۔ وہ آیا اور اپنے دوست کے ساتھ میرے پاس ہی ٹھہرا۔ اس کا یہ دوست امرتسر کے ایک معروف کاروباری خاندان کا فرد تھا۔ ان دونوں نے شاید کسی الاٹمنٹ کے سلسلے میں پشاور کا سفر اختیار کیا تھا۔ میں نے منٹو کی ہر ممکن مدارات کی اور شام سے پہلے اس کے لیے وسکی کا بھی بندوبست کیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی مجھ سے ملا' یہی کہتا تھا کہ "آخر وسکی کی بوتل خریدنے کا جرمانہ تمہیں کیوں ادا کرنا پڑے جب کہ تم ایک قطرہ چکھنے کے بھی گنہگار نہیں ہو۔ میرے حالات سدھر جائیں تو میں تمہیں وسکی کی اس پشاور والی بوتل کی قیمت ہر صورت میں ادا کروں گا۔" میں نے ہمیشہ منت کی کہ منٹو صاحب' آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہیں۔ اور وہ کہتا تھا کہ "کانٹوں میں تو میں گھسٹ رہا ہوں!" ہم سب جانتے ہیں کہ کسی بھی شراب نوش سے اس انتہا کی خوش اخلاقی کی توقع نہیں کی جا سکتی' مگر یہ منٹو تھا۔ منفرد اور سربرآوردہ۔ وہ پشاور میں تین روز میرے ہاں رُکا۔ میرے ہمراہ ریڈیو سٹیشن پر بھی جاتا رہا۔ وہاں کے ڈائریکٹر جناب سرور نیازی سے بھی اس کا تعارف تھا اور پھر وہاں ن۔م۔راشد اور حمید نسیم بھی موجود تھے۔ دلچسپ محفلیں رہیں' میرے اندازے کے مطابق منٹو الاٹمنٹ کی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا ورنہ اسے گزر بسر کے لیے بعد میں اپنے افسانے اونے پونے نہ بیچنے پڑتے۔

میں بھی ۱۹۴۸ء کے شروع میں لاہور آ گیا۔ یہاں میں نسبت روڈ پر اپنی منہ بولی بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے خاندان کے ساتھ' اس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے پندرہ سولہ برس مقیم رہا۔ منٹو یہاں کئی بار مجھ سے ملنے آیا۔ میں ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کا سیکرٹری تھا۔ منٹو

کے ہاں میں جب بھی گیا' وہاں محمد حسن عسکری کو موجود پایا۔ عسکری ترقی پسند ادب کی تحریک کے سخت مخالف تھے اس لیے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ روشن خیال منٹو کو فرانس کے منفیت پسندوں اور لایعنیت نوازوں سے متاثر کرنے کی کوشش کریں گے' چنانچہ میں نے پشاور سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی ادارت میں شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے ''سنگِ میل'' میں ''منٹو کے نام'' ایک کھلا خط لکھا جس میں منٹو کی حیرت انگیز تخلیقی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ ہی میں نے اسے خبردار کیا کہ وہ عسکری کے بے معنویت اور ساتھ ہی ماورائیت کے رجحانات سے متاثر نہ ہو۔ منٹو میرا یہ خط پڑھے بغیر' غصے میں بھرا ہوا میرے ہاں آیا۔ اس نے اندر کمرے میں بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ دروازے ہی میں کھڑے کھڑے اس نے اپنی چیختی ہوئی آواز میں کہا ''تم نے مجھے کھلا خط لکھا ہے نا احمد ندیم قاسمی' میں تمہارے نام بند چٹھی لکھوں گا۔'' (وہ مجھے ہمیشہ میرے پورے نام سے مخاطب کرتا تھا) میں نے کہا کہ آپ جو چاہیں لکھیں مگر کیا آپ نے میرا یہ خط پڑھ بھی ہے؟ معلوم ہوا کہ اس نے خط تو نہیں پڑھا مگر اسے اس کے بعض دوستوں نے بتایا ہے کہ میں نے اس خط میں اس کے خلاف زہر اگلا ہے۔ میں لپک کر ''سنگِ میل'' کا وہ شمارہ اٹھا لایا جس میں منٹو کے نام میرا خط چھپا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے پڑھنے کے بعد جو چاہیں کہیے گا یا لکھیے گا۔ منٹو رسالہ لے گیا۔ دو تین روز کے بعد میں خود لکشمی مینشنز میں اس کے گھر گیا اور پوچھا ''میرا کھلا خط پڑھ لیا آپ نے؟'' منٹو کے چہرے پر سکون تھا اور آسودگی کی مسکراہٹ تھی۔ بولا ''ہاں پڑھ لیا۔ نرا فراڈ ہے!'' (فراڈ منٹو کا محبوب لفظ تھا) میں سمجھ گیا کہ منٹو میرا خط پڑھ کر خوش ہوا ہے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا اور چائے سے میری مدارات کی۔ کہنے لگا مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو کہ میں عسکری کی منفیت پسندی کے وعظ یا تمہارے ترقی پسندی کے لیکچر سے

متاثر اور مرعوب ہو سکتا ہوں۔ میں وہی لکھتا رہوں گا جو میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔ عسکری شریف آدمی ہے' دروازے پر آواز آتی ہے "میاؤں" یعنی میں آ جاؤں۔ کچھ دیر وہ میری کسی ننھی بچی سے لاڈ پیار کرتا ہے۔ پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے "میاؤں" یعنی میں جاؤں! ---- اور تم کہتے ہو کہ وہ مجھے بھٹکا رہا ہے!" ----

اُس روز میں نے منٹو کو بہت خوش دیکھا۔ اس نے ایک واقعہ بھی سنایا "ایک عقیدت مند میرے پاس روزانہ آتا ہے اور میرے سارے سگریٹ پی جاتا ہے۔ آج میں بیڈن روڈ سے سگریٹ کا نیا پیکٹ خرید کر گھر آیا تو فوراً بعد دروازے پر سے اُس عقیدت مند کی آواز آئی۔ میں نے سگریٹوں کا نیا پیکٹ بھرا ہوا پیکٹ نیچے فرش پر پھینک دیا۔ پھر اسے اندر بلایا۔ بیٹھتے ہی اس نے سگریٹ طلب کیا۔ میں نے کہا پیکٹ ابھی ابھی ختم کر کے پھینکا ہے۔ وہ پڑا ہے۔ وہ بولا "کوئی بات نہیں' کبھی کبھار سگریٹ پیے بغیر بھی آپ سے گفتگو کرنی چاہیے۔" وہ گفتگو کرتا رہا۔ پھر جانے کے لیے اٹھا۔ دروازے پر جا کر پلٹا اور فرش پر پڑا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر یہ کہتے ہوئے جیب میں ڈال لیا۔ "بچے بھیجیں گے ----" ہم دونوں اس واقعے پر خوب ہنسے اور بعد میں ہماری اس ہنسی میں صفیہ بھابھی بھی شامل ہو گئیں۔

میں منٹو کی صفائی پسندی کا ذکر تو کر چکا ہوں۔ ایک روز وہ میرے گھر آیا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جو آج کل شاعر خالد احمد کا ڈرائنگ روم ہے۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس نے کمرے کی دیواروں کو حیرت سے دیکھا اور کہا "یہ سفیدی کس نے کی ہے؟" میں نے کہا "سفیدی کرنے والے نے کی ہے۔ اور کون کرتا۔" منٹو نے کہا "نہایت نالائق آدمی تھا کہ جہاں جہاں سے بچ کر گزرا' اپنے نقوش چھوڑتا چلا گیا۔ سارے کمرے کا ناس مار دیا اس کم بخت

نے۔ تم شاعر ہو کر بھی ایسے بیہودہ کمرے میں بیٹھے ہو۔ ادھر آؤ میرے ساتھ۔" منٹو اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے بازو سے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ "چلو آؤ۔" میں نے پوچھا "کہاں منٹو صاحب؟" بولا "تم چلو تو سہی۔" وہ مجھے اپنے گھر لے آیا اور ڈرائنگ روم کی دیواریں دکھا کر بولا "اسے کہتے ہیں سفیدی۔" واقعی دیواروں پر نہایت معیاری سفیدی ہوئی تھی۔ پھر منٹو نے کہا "جانتے ہو یہ سفیدی کس نے کی؟ میں نے کی۔" میں نے شبہے کا اظہار کیا تو وہ اندر سے صفیہ بہن کو بلا لایا انہوں نے کہا۔ "یہ سفیدی سعادت ہی نے کی ہے۔ میں روکتی رہی مگر وہ کہتے رہے کہ دیکھتی جاؤ۔ ایسی نفیس سفیدی کروں گا جیسا نفیس افسانہ لکھتا ہوں۔" اور منٹو میرے افسانوں کا حوالے دیئے بغیر بولا۔ "اور میں ندیم کے ہاں ایسی سفیدی دیکھ کر آ رہا ہوں جیسے کساں نے کھیت میں ہل چلایا ہو!"

صفیہ بہن نے میرا بہت دفاع کیا مگر ان کی کوشش بیکار رہی کیونکہ انہوں نے میرے کمرے کی سفیدی دیکھی نہیں تھی۔ اس سے چند سال پہلے بھی صفیہ بہن نے دہلی میں بڑی استقامت سے میرا دفاع کیا تھا مگر منٹو کے سامنے انہیں اور مجھے ہتھیار ڈال دینا پڑے تھے۔ میری افسانہ نگاری کے ابتدائی دن تھے۔ میں رسالہ "ساقی" (دہلی) کے لیے اپنا ایک افسانہ "السلام علیکم" ساتھ لایا تھا۔ شاہد صاحب کے ہاں جانے سے پہلے منٹو نے اسے پڑھا مگر اس کا آخری پیرا پڑھ کر مجھ سے باقاعدہ الجھنے لگا۔ "یوں ختم کیا جاتا ہے اتنا عمدہ افسانہ؟ یوں بیڑا غرق کیا جاتا ہے ایسی اچھی تحریر کا؟ تم نے تو انجام تک پہنچ کر سارے افسانے کا ناس مار دیا۔" صفیہ نے منٹو کی اس تنقید کا بہت برا مانا۔ ایک تو میں ان کا مہمان تھا۔ پھر منٹو کا ہم سن افسانہ نگار تھا۔ صفیہ بہن منٹو سے لڑائی پر تل گئیں۔ میں نے بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کیا مگر منٹو نے ہماری ایک نہ مانی اور قلم ہاتھ میں لے کر میرے افسانے کا آخری صفحہ لکھ ڈالا۔ پھر بولا "اب پڑھو۔" میں نے پڑھا

کی قرارداد کے ذریعے منٹو کو بالواسطہ طور پر فحش نگار اور رجعت پسند قرار دے دیا گیا تھا۔ میں منٹو کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ منٹو بھی محمد حسن عسکری کی معیت میں ایک رسالہ ''اردو ادب'' مرتب کرنے لگا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں میری شاعری کے خلاف یوسف ظفر کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں یوسف ظفر نے میرے مجموعہ کلام 'جلال و جمال'' میں شامل میری تصویر کو بھی ہدف بنایا تھا اور لکھا تھا کہ میں تصویر میں کیمرے کی طرف نہیں دیکھ رہا اس لیے ثابت ہوا کہ میں نے حقائق سے فرار اختیار کر رکھا ہے۔ ایک تقریب میں منٹو سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس تنقید کی مضحکہ خیزی کا ذکر کیا۔ منٹو نے جواب دیا ''تم بائیکاٹ کی مضحکہ خیز قراردادیں منظور کراؤ گے تو ہم بھی تم پر مضحکہ خیز تنقید کریں گے۔'' میں نے منٹو کو یقین دلایا کہ میں جنرل سیکرٹری ہونے کے باوجود اس قرارداد کا مخالف تھا البتہ اکثریت کا ساتھ دینا پڑا۔ مگر منٹو یہ جواز ماننے کو تیار نہ تھا۔ پھر جب انجمن نے کراچی میں ۱۹۵۲ء کی کل پاکستان کانفرنس میں یہ قرارداد باقاعدہ واپس لے لی تو منٹو کا غصہ خاصا کم ہوا اور پھر سے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔

چند ملاقاتیں یادگار رہیں۔ ایک دن منٹو کسی کام سے میرے گھر آیا۔ اس وقت عبدالمجید بھٹی مجھے اپنے ایک ناول کا ایک باب سنا رہے تھے۔ منٹو نے مجھ سے بات کی اور جانے کے لیے اٹھا تو بھٹی نے کہا ''منٹو صاحب کچھ دیر تشریف رکھیے۔ میری شاعری سے تو کتابوں کے ناشرین واقف ہیں مگر انہیں معلوم نہیں کہ میں فکشن بھی لکھتا ہوں۔ میں ندیم صاحب کو اپنے ناول کا ایک باب سنا رہا ہوں کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو کسی ناشر سے اس ناول کی اشاعت کا بندوبست کرا دیں۔ آپ بھی سن لیجیے اور مجھے مشورہ دیجیے کہ کیا میرا اسلوب درست ہے یا قابلِ اصلاح ہے۔''

کام ---- سوائے اس کے کہ اپنے رسالے کے لیے تم سے کچھ مانگے۔ وہ تمہیں کچھ معاوضہ دے گیا ہوگا۔" میں نے کہا "آپ ٹھیک سمجھے۔ یہ پچیس روپے جو میز پر رکھے ہیں، وہی دے گیا ہے۔ یہ آپ لے جائیے۔" منٹو بولا "نہیں سب نہیں، مجھے صرف پندرہ روپے درکار ہیں۔ باقی دس تمہارے کام آئیں گے۔" تب منٹو نے پندرہ روپے اٹھا لیے اور چلا گیا۔ مجھے بڑی تسکین محسوس ہوئی کہ خدا نے ایک عزیز دوست کی ایک مشکل میرے توسط سے آسان کر دی۔

اُس روز ہمارے محلے میں ایک شادی تھی۔ شادی والے گھرانے سے منٹو کے بھی تعلقات تھے اور دوسرے کئی ادیب بھی مدعو تھے۔ میں جب شادی والے گھر پہنچا تو بہت سے لوگ موجود تھے مگر وہاں مجھے کوئی ادیب نظر نہ آیا۔ معلوم ہوا ادیب آئے تو ہیں مگر اس وقت نسبت روڈ کے فلاں ڈاکٹر کے کلینک میں گپ شپ کے لیے جمع ہیں۔ میں پہنچا تو کلینک کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کو ہاتھ لگایا تو کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ ادیبوں کے اس ہجوم میں منٹو سامنے میز پر بیئر کی بوتلیں رکھے پی رہا ہے۔ مجھے دیکھا تو میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور ندامت دیکھی۔ اس نے صرف اتنا کہا "تم یہاں کیسے آ ٹپکے احمد ندیم قاسمی!" میں نے جواب میں صرف مسکرا دینا بہتر سمجھا اور منٹو کے پاس بیٹھ گیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا جو اس کے اعلیٰ معیار سے خاصا ہٹا ہوا تھا اور مجھے کمزور محسوس ہوا۔ زندگی کے آخری دور میں، عجلت کی وجہ سے وہ اسی طرح کی کہانیاں لکھنے لگا تھا۔ اس پر تنقید کا سلسلہ جاری تھا جب منٹو بولا۔ "یہ احمد ندیم قاسمی بھی میرے پاس بیٹھا ہے صدر صاحب! اس سے بھی تو افسانے کے بارے میں پوچھیے۔" میں نے کہا "یہ افسانہ منٹو کے اسلوب کی کامیاب نمائندگی کرتا ہے۔ وہی سلاست ہے وہی روانی ہے، وہی غیر ضروری

خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ آج کل ہماری بول چال بند ہے اور سنا ہے اس نے مکان بھی بدل لیا ہے۔ خان صاحب طیش میں اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے منٹو کے پاس جانے سے پہلے ایک مختصر سی سٹاف میٹنگ بلائی۔ میٹنگ ختم ہوئی تو میں ادھر جانے کے لیے اٹھا' اُدھر وہی خان صاحب مسکراتے ہوئے میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ بولے ''وہ آپ کا یار منٹو ہم کو مل گیا تھا۔ ہم ظہیر کاشمیری سے اس کا پتہ پوچھتے جا رہا تھا کہ منٹو ہی بیڈن روڈ پر مل گیا۔ ہم نے کہا ''اور آؤ' تم نے ہمارے خلاف افسانہ لکھا۔'' منٹو بولا ''آپ کے خلاف نہیں لکھا آپ کے بارے میں لکھا ہے۔'' میں نے کہا ''کیا لکھا ہے؟'' وہ بولا ''یہی لکھا ہے کہ خان شراب پیتا ہے اور رنڈی بازی کرتا ہے۔'' میں نے گھبرا کر پوچھا ''پھر؟'' خان صاحب بولے ''پھر کیا' وہ تو اس نے ٹیک (ٹھیک) لکھا ہے نا۔۔۔۔''

منٹو ایک روز 'امروز'' کے دفتر میں آیا اور بولا ''میں نے زندگی میں پہلی بار پنجابی زبان میں کہانی لکھی ہے۔ تم اپنے اخبار میں پنجابی صفحہ چھاپتے ہو اس لیے یہ کہانی اس میں درج کر دو۔'' میں نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور مسودہ اس سے لے لیا۔ پنسل سے لکھا ہوا یہ افسانہ میں نے پڑھا تو اس میں منٹو مجھے فن کے اس اوج پر نظر آیا جس پر وہ برسوں پہلے پہنچ چکا تھا۔ میں نے دفتر سے اسے افسانے کا پیشگی معاوضہ دلوا دیا اور پروگرام یہ بنایا کہ یہ افسانہ چھاپنے سے پہلے ''پنجابی زبان میں منٹو کی پہلی کہانی'' کے عنوان سے اس کی خوب تشہیر کروں گا۔ مگر چند روز بعد ہی پولیس میرے دفتر کی تلاشی لینے آ دھمکی اور اس نے مسودات اتنی بے رحمی سے الٹے پلٹے کہ منٹو کی کہانی کہیں غائب ہو گئی۔ میں جب تک ''امروز'' میں رہا' پرانی فائلوں میں اسے تلاش کرتا رہا مگر وہ شاید پولیس کے ہتھے چڑھ کر پار ہو گئی تھی!

آخری دنوں میں وہ "ناخن کا قرض" کے عنوان سے اپنے فن کے بارے میں معروف اہلِ فن سے ان کے تاثرات جمع کرتا پھر رہا تھا۔ میرے پاس آیا تو ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور بولا "میرے متعلق جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں فوری طور پر خیال آئے وہ یہاں لکھ دو۔" میں نے کہا "میں منٹو کی بڑی اور محبوب شخصیت کے بارے میں لکھوں گا تو سوچ سمجھ کر لکھوں گا۔" اسے غصہ آ گیا "عجیب فراڈ ہو۔ میں عبدالرحمن چغتائی اور ملکہ پکھراج اور امتیاز علی تاج سے ان کا فوری تاثر لکھوا کر لا رہا ہوں اور تم ایک دم آسمان پر جا بیٹھے ہو۔" میں نے کہا "منٹو صاحب میرا تاثر آج شام تک آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔" مان گیا۔ بولا "شام تک نہ پہنچا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "پہلے آپ تھوڑے سے بڑے تو بنئے۔ پھر برائی کا کمپیٹیشن کرائیے گا۔" وہ مسکرایا اور چلا گیا۔ شام سے پہلے میں نے اس کے ہاں اپنا تاثر پہنچا دیا۔ میں نے لکھا کہ میں منٹو کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بلا کا ضدی ہے۔ اگر حکومت اس کے افسانے "نیا قانون" کے خلاف مقدمہ چلاتی تو وہ حکومت کو تنگ کرنے کے لیے "نیا قانون" سے بھی بڑے افسانے لکھتا۔ مگر کوتاہ اندیش حکومت نے اس کے افسانوں "کالی شلوار" اور "ٹھنڈا گوشت" اور "دھواں" کے خلاف کیس چلائے اور منٹو نے ضد میں آ کر ایک سے ایک جنسی افسانے لکھے اور یوں منٹو کی ہمہ جہتی اور اس کے ہاں موضوعات کے تنوع کو نقصان پہنچا۔ منٹو کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بتاتے ہیں کہ جب اسے میرا لفافہ ملا تو اس نے جیسے نفرت سے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ گھنٹہ بھر بعد اٹھا۔ ٹہلتا ہوا فرش پر پڑے لفافے کے پاس گیا۔ اسے اٹھایا، کھولا، پڑھا اور کمال آسودگی سے بولا "یہ میرا یار احمد ندیم قاسمی نہ جانے کیا چیز ہے میری سمجھ میں تو آتا نہیں" اور اس نے میرا تاثر تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے میرا تاثر قبول کر لیا ہے۔

آخر آخر میں ایک روز ایک ناشر کے ہمراہ وہ میرے پاس آیا۔ ناشر سے کہا کہ بوتل تھیلے سے نکال کر میز پر رکھ دو۔ اس نے وہسکی کی بھری ہوئی بوتل میز پر رکھی تو منٹو مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''اٹھیے احمد ندیم قاسمی صاحب! اس کمرے کی گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیجیے اور مجھے ایک گلاس اور ایک جگ میں پانی لا دیجیے۔ آج میں یہیں پیوں گا اور آپ کے پورے محلے میں شراب کی بو پھیلاؤں گا۔''

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اوپر سے گلاس اور جگ لے آیا اور بولا ''بسم اللہ کیجیے۔'' اس نے حیرت سے مجھے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے دیکھا جو صحت کی کمزوری کی وجہ سے کچھ اور موٹی لگ رہی تھیں۔ پھر اس نے ناشر کو رخصت کر دیا اور ایسی آواز میں بولا جیسے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے ''میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ تم مجھے نہیں سمجھ سکے۔ پھر ہم آپس میں دوست کیوں ہیں۔''

اس روز میں نے پہلی بار دیکھا کہ منٹو کا شیو بڑھا ہوا ہے اور اس کے پاجامے کی کریز بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا ''پیجیے۔ میں بوتل کھولوں؟'' منٹو ہنسا ''تم کیا خاک بوتل کھولو گے۔ تم کھولو گے تو کھلنے کے اس دھماکے کو سارا محلہ سنے گا۔'' پھر وہ کھڑا ہوا۔ بولا ''چلو آؤ میرے ساتھ۔ بوتل کوٹ کے اندر چھپا لو۔'' میں بوتل چھپا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رستے میں وہ بولا ''یہ جو تم ترقی پسندوں کے لیڈر بنے پھرتے ہو نا، ان میں سے اگر کسی کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس وقت منٹو کے پاس وہسکی کی پوری بوتل ہے اور وہ پینے جا رہا ہے تو وہ بھکاریوں کی طرح میرا پیچھا کریں گے۔'' میں خاموش رہا۔

گھر پہنچ کر اس نے بوتل مرکزی تپائی پر رکھی اور اندر پانی لینے چلا گیا۔ تب صفیہ بہن چند سیکنڈ کے لیے آئیں اور مجھ سے کہا ''ندیم بھائی! خدا کے

اور اب (۱) منٹو کے فن کے بارے میں چند مختصر باتیں اور "سنگِ میل" میں

شائع ہونے والا منٹو کے نام میرا کھلا خط

(۱)

نسائیت کے بارے میں منٹو کا تصور بیشتر رومانٹک ہے مگر رومانٹک ہونا کوئی گناہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ ان ادیبوں کا نقطۂ نظر بھی رومانٹک ہو سکتا ہے جن میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے یا جو تغیر اور ارتقا کے سلسلے میں بداعتمادی یا بے اعتقادی کے شکار ہوتے ہیں مگر منٹو اس معاملے میں عالمی ادب کی کئی بڑی بڑی شخصیتوں کی طرح صرف اس لیے رومانٹک ہے کہ وہ آرزو کر سکتا ہے۔

آرزو مروجہ حالات میں پسندیدہ تبدیلی کی خواہش کا دوسرا نام ہے اور اگر کسی ادیب سے یہ آرزو بھی چھن جائے تو وہ خواب دیکھنے پر بھی قادر نہیں رہتا۔ وہ صرف دو جمع دو مساوی چار کے فارمولے پر عمل کرتا رہ جاتا ہے اور اس کے ہاں حقیقت اور فنی حقیقت کے درمیان امتیاز کی حس شل ہو جاتی ہے۔

منٹو کے ہاں تغیر اور تبدیلی کا کوئی بڑا فلسفہ نہ سہی مگر اس میں آخری دم تک آرزو کرنے کی سکت باقی رہتی ہے اور اپنے ذہن میں آرزو کی قندیل کو ایسے حالات میں بھی روشن رکھنا، جب بحیثیت مجموعی معاشرے کا خون صرف سفید ہی نہیں سیاہ ہو چکا ہے، کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

منٹو نے معاشرے کے جن افراد کو اپنے افسانوں کا ہیرو بنایا ہے وہ بیشتر ایسے لوگ ہیں جنہیں معاشرہ سماجی اور اخلاقی لحاظ سے رد کرتا ہے۔ بھوک اور احتیاج نے ان کی انسانیت کو چاٹ لیا ہے اور انسانیت کے معیاروں کے اس المیے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی روحیں بھی سنسان ہیں۔ اس کے باوجود یہ غنڈے، یہ بدمعاش، یہ جیب کترے، یہ طوائفیں، یہ دلال، انسانی فطرت کی بنیادی نیکی سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ اسی لیے یہ بدکار لوگ اپنی بدکاری ہی کے عمل میں، نیکوکاری

جرمانے میں ننگا کرنے کی کوشش کی۔

معاشرے کی یہی قوتیں' فراد کی حیثیت اختیار کر کے' منٹو کی کہانیوں کے ویلین بن جاتی ہیں۔ یہ بظاہر بڑے مقطع چقطع لوگ ہوتے ہیں۔ انہوں نے تقدیس اور وقار کے لبادے اوڑھ رکھے ہوتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی عظمت کی قبائیں ان کے زیب تن ہوتی ہیں' مگر جب منٹو ان لبادوں کو نوچتا اور قباؤں کو اتارتا ہے' تو نیچے سے ایسے ایسے غنڈے' ایسے ایسے بدمعاش برآمد ہوتے ہیں کہ پورا معیشی' معاشرتی اور اخلاقی ڈھانچہ' سب معنی' بے کار اور بودا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یوں منٹو اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے کہ انسان کے اندر خیر کی قوت کبھی مردہ نہ ہونے پائے' اور معاشرے کی جو سفاک قوتیں' خیر کی اس فطری حس کو مفلوج کرنے میں کوشاں ہیں' انہیں مزید پنپنے سے روکا جائے۔

منٹو کے ہاں آج کل بہت کچھ دریافت کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ کوئی منٹو کو فرائڈ کی رو سے دیکھتا ہے اور کوئی ژونگ کے حوالے سے اس پر گفتگو کر رہا ہے۔ کسی کو منٹو میں سمرسٹ ماہم نظر آتا ہے تو کسی کو ڈی۔ایچ۔ لارنس۔ کوئی منٹو کو یوں داد دیتا ہے کہ اس نے اخلاقی اور قانونی ضابطوں سے بے نیاز ہو کر کتنی بے خوفی سے عریاں نویسی کی۔ کسی کا ارشاد یہ ہے کہ منٹو نے جنس کے موضوع پر سپیشلائز کر کے بڑی دانائی اور دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ جب تک ان حضرات کو منٹو کے افسانوں میں پھیلی ہوئی بداخلاقی کی دھند میں اخلاق کا وہ چمکتا ہوا تارا نظر نہیں آئے گا جس کی دریافت نے منٹو کو بڑا اور سچا اور نڈر افسانہ نگار بنایا' اس وقت تک منٹو کے فن کے جائزے اور اس کے کرداروں کے تجزیے ادھورے رہیں گے۔

"اردو ادب" کے لیے میں نے ایک نظم بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔

یکم اگست ۱۹۴۸ء کو ہاجرہ بہن کے نام آپ کا ایک خط آیا۔ آپ نے ان سے "اردو ادب" کے لیے ان کی "نگارشات" طلب کی تھیں۔ اس خط پر آپ کے علاوہ محمد حسن عسکری کے دستخط تھے۔ میں نے اس خط کو نہایت شوق سے پڑھنا شروع کیا کیونکہ اس میں "اردو ادب" کی پالیسی کے اعلان کی توقع تھی۔ ہاجرہ بہن سے میں نے شرط بھی بدی۔ وہ کہتی تھیں کہ محمد حسن عسکری کی مبہم نویسی کی شہرت چیچی گولی کے مترادف ہے اور منٹو جیسا سخت گیر انسان بھی اس کا فریب کھا سکتا ہے۔ مجھے ان سے اتفاق نہ تھا لیکن پہلی ہی سطر میں یہ پڑھ کر کہ "یہ رسالہ کسی مخصوص مدرسہ فکر کا پابند نہیں" میں چونکا۔ میں شرط ہار گیا تھا۔ میری بہن کو شرط جیت لینے کی کوئی خوشی نہ تھی، بلکہ وہ نہایت اداس ہو کر بولیں "یہ عسکری صاحب بول رہے ہیں۔" اور میں نے اپنے غیر متزلزل یقین کے سہارے کہا "آگے چل کر منٹو بھی کوئی بات کہے گا اور ہمیشہ کی طرح کوئی ایسی بات اور کچھ اس انداز سے کہے گا کہ عسکری کی آواز دب جائے گی۔" ---- میں خط پڑھتا گیا اور میری آواز مدھم ہوتی گئی اور جب میں خط ختم کر چکا تو مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک بہت بڑی ذہنی شکست سے دوچار ہوا ہوں۔ بحیثیت انسان آپ ہمیشہ مجھے بہت عزیز رہے ہیں لیکن میری نظروں میں بحیثیت ادیب بھی آپ کی وقعت کچھ کم نہیں اور شاید آپ پہلے ادیب ہیں جن کی زندگی اور آرٹ میں نہایت خوشگوار تعاون کارفرما ہے---- میں دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا---- کاش اس خط پر آپ کے دستخط نہ ہوتے! کاش آپ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہوتا! کاش آپ دستخط کرنا بھول گئے ہوتے! کاش آپ کی انفرادیت یوں بے خبری میں کچلی نہ جاتی! اور کاش آپ سوچتے کہ آپ کو ہوش میں لانے والا انجکشن دینے کے بجائے ایک نیند آور دوا کے نسخے پر دستخط

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا آج ان حالات کا حسن عسکری کے ژیدی اور بودلیئری اور فلابیری نظریت نے خاتمہ کر دیا ہے؟ کیا بقول آپ کے ''عورتوں اور مردوں کے درمیان جو موٹی دیوار'' حائل تھی وہ دیوار گر چکی ہے؟ '' دیوار جس کے چونے کو عصمت چغتائی نے اپنے تیز ناخنوں سے کریدنے کا عزم کیا تھا کیا کشمیر کے حسین دیہات میں سے شہروں کی ''گندگی'' غائب ہو چکی ہے۔ جسے ہر طرف منتشر دیکھ کر ''غریب کرشن چندر ہولے ہولے رویا کرتا تھا'' ۔۔۔۔ کیا انسانوں کی اور خاص طور پر سعادت حسن منٹو کی '' ''کمزوریاں'' دور ہو چکی ہیں جنہیں آپ نے خوردبین سے دیکھ دیکھ کر ہم کانے اور دوسروں کو دکھاتے رہنے'' کا تہیہ کیا تھا؟۔۔۔ اگر سماج کی یہ سب شکایتیں ختم ہو چکی ہیں تو ترقی پسند ادب کو خوشی سے خیر باد کہہ دیجئے' لیکن اگر عورت اور مرد کے درمیان جو موٹی دیوار حائل تھی وہ اور اونچی' اور موٹی ہو گئی ہے اور اگر اب ہمارے دیہات میں شہروں کی گندگی کے ڈھیروں کی بجائے پہاڑ اُگ آئے ہیں اور ہواؤں تک میں تعفن بس چکا ہے' اور اگر انسان اب سر تا سر کمزوری بن کر رہ گیا ہے تو میرے بھائی یہ ''ادب'' اسی طرح قائم ہے اور عصمت' کرشن' بیدی اور منٹو کے فرائض ابھی ختم نہیں ہوئے اور محمد حسن عسکری کی عبارت پر بھی آپ کے دستخط مجھے معلوم نہیں ہوتے۔

میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلمان کہا ہے۔ میں کمیونسٹ بھی نہیں ہوں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ ممبر بھی نہیں ہوں۔ کشمیر پر ہندوستانی فوجوں کی چڑھائی کو استبدادی اقدام سمجھتا ہوں۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین میں ہر سیاسی خیال کے ادیب کی شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے فیض احمد فیض کو اور مجھے لیگی قرار دے چکے ہیں۔ میں اپنے وطن کا وفادار ہوں۔ پاکستان ہماری رگ جان ہے مگر میں محمد حسن عسکری کے ادبی نظریات سے متفق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے

بارے میں اپنے ملک کی بھلائی اور ترقی کی روشنی میں سوچتے ہیں۔ آپ کو ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی جب پاکستان کے کسی ترقی پسند ادیب نے اپنی تحریر میں پاکستان سے غداری کا اعلان کیا ہو۔ پھر آپ کے شریک کار محمد حسن عسکری

بار بار یہ اعلان کرنے پر کیوں مجبور ہیں کہ ترقی پسند ادیب (جنہیں انہوں نے کپلنگ کی "بندر لوگ" کی اصطلاح کے مطابق "ادیب لوگ" کے نام سے محض اپنی ذہنی آسودگی کے لیے یاد فرمایا ہے) نوجوانوں اور طالب علموں کو ورغلا کر پاکستان کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ دراصل ترقی پسند ادب ایک ہوا بن کر حسن عسکری کی تمام نقادانہ قوتوں پر سوار ہو چکا ہے ورنہ سعادت بھائی! کیا پاکستان کے عوام کو (جو ننانوے فی صد مسلمان ہیں) ان کا حق دینا پاکستان سے غداری ہے؟ کیا فتنہ و فساد کے واقعات پر نفرین بھیج کر آئندہ کے لیے اس غیر انسانی مشغلے کی روک تھام پاکستان سے غداری ہے؟ کیا جاگیرداری اور سرمایہ داری کے اداروں کی بیخ کنی پاکستان سے غداری ہے؟---- اور کیا یہ غداری نہیں کہ ہندوستانی ترقی پسندوں کی تحریروں کا سہارا لے کر پاکستانی ترقی پسندوں کے خلاف زہر اگلا جائے؟ کیا یہ غداری نہیں کہ پاکستانی ادیب کے سامنے آندرے ژید کی مثال رکھی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ وفاداری ملک سے نہیں حکومت سے وابستہ ہونی چاہیے؟ اور کیا یہ غداری کی انتہا نہیں کہ ہم نئے حاکم کو ملک کی حکومت سونپ دینے کے بعد اس کے حق میں قصیدہ خوانی کی ترغیب دی جائے؟

مصیبت یہ ہے کہ محمد حسن عسکری ترقی پسند ادیبوں میں جن قوتوں کے فقدان کا ماتم کرتے ہیں انہی قوتوں کے فنی اظہار پر بوکھلا بھی جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسندوں سے پوچھتے ہیں "آپ کے دل میں اپنے عوام کا کتنا درد اور ان کی کتنی عزت ہے؟" میرے خیال میں اس سوال کا صرف یہ جواب کافی ہے "ہماری تحریک کی بنیاد ہی عوام کے درد کو اپنا درد سمجھنے اور ان کے احترام پر مبنی

ہے۔''---- وہ پوچھتے ہیں ''ان کے عزائم اور ان کے آدرشوں کی آپ کیا وقعت کرتے ہیں؟''---- جواب یہ ہے ''کہ ان کے عزائم اور آدرشوں کا تجزیہ ہی تو ارباب اختیار کو اور آپ کو آتش زیر پا کر دیتا ہے۔''---- ترقی پسند ادیب قوم سے حسن عسکری کی طرح بے تعلق نہیں' وہ پاکستان کے کروڑوں عوام کے سچے بہی خواہ اور مخلص ہمدرد ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا احساس اور اعتراف ہے کہ پاکستان کے تحفظ اور طاقت انہی میں اور تحفظ عظمت پوشیدہ ہے۔ حسن عسکری نے ان کے اس قصور کی بنا پر ان کی کتابوں کا الاؤ لگانے اور ان کو پھانسی دے کے چھوڑ دینے کے خواب دیکھے ہیں۔

اور پھر انسانیت پرستی کوئی ایسی لعنت تو نہیں کہ حسن عسکری اپنی ''تحقیقوں'' اور اپنی ''فتواوں'' میں اس سے بدک بدک اٹھتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت میں انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان سے بڑا انسانیت پرست اور کون ہوگا؟ انسانیت پرستی ہمیں یقیناً اپنے وطن سے غداری کرنا نہیں سکھاتی۔ دراصل جب بھی کوئی ادیب طبقاتی تقسیم' جاگیرداری' زمینداری اور سرمایہ داری کے خاتمے اور انسان پرستی کا ذکر کرتا ہے تو پیر محمد حسن عسکری ہی نہیں (کہ ان کی تو یہ عادت ہو چکی ہے) ہر وہ انسان جس کا مفاد ان غیر انسانی اداروں سے وابستہ ہے چونک اٹھتا ہے اور اسے سچا مسلمان کہنے کے بجائے ''دہریوں'' کی ٹولی دکھائی دیتا ہے۔ اور جب حسن عسکری ترقی پسندوں کو روس کا ایجنٹ ثابت کرنے بیٹھتے ہیں تو سجاد ظہیر اور احتشام حسین کے علاوہ فیض' خدیجہ' ہاجرہ' آپ کا اور میرا نام کیوں نہیں لیتے؟

لیکن آپ کا تو انہوں نے گذشتہ دنوں بڑے پیارے انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ ''امروز'' ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں (آپ نے اسے صرف پڑھا ہی نہیں ہوگا بلکہ سنا بھی ہوگا)۔

> ''منٹو کے افسانوں میں پہلے مجھے کوئی گہری دلچسپی نہیں تھی مگر اب جب وقت نے کھرا کھوٹا الگ کرنا شروع کر دیا(۱) ہے' تو پتہ چلتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں منٹو ہی ایک ایسا آدمی تھا جسے براہِ راست انسانی دماغ اور اس کی کیفیات سے دلچسپی تھی----''

''کیوں صاحب آج سے پہلے جب آپ اُردو افسانے کی دنیا کو خالی ڈھنڈار سمجھتے تھے' اُن دنوں بھی تو منٹو کے وہی مجموعے بازاروں میں بکتے تھے جو آج بک رہے ہیں اور ۱۵۔ اگست ۱۹۴۸ء تک وہی بک رہے تھے۔ اُس روز تک منٹو کے افسانوں کا کوئی نیا مجموعہ نہیں آیا تھا لیکن اچانک آپ کو منٹو سے یہ گہری دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی؟''----حسن عسکری سے کبھی یہ سوال پوچھا آپ نے؟

یقیناً نہیں پوچھا ہوگا۔ اب بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ جواب میں عرض کئے دیتا ہوں۔ تنقید کی چٹان سے اچانک منٹو کے فنی کمالات کا جو فوارہ بلند ہوا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ محمد حسن عسکری کو آپ سے ایک ضروری کام ہے اور وہ ہے ترقی پسندوں کی صفوں میں انتشار۔

وہ اس انتشار کے اس قدر خواہشمند کیوں ہیں؟ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ تقسیم ہند سے پہلے ان کے سیاسی نظریات کمیونسٹ ادیبوں سے مختلف رہے ہیں' اور وہ اب تک ان کا ڈھنڈورا پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ سیاسی نظریات کے اختلاف پر صحت مند بحث و تمحیص نہایت مفید رہتی ہے لیکن ادب کو خالص سیاسی یا ذاتی دشمنیوں کے چنگل میں گھسیٹنے اور رگیدنے کا مقصد؟----

۱۔ یعنی جب سے ''اردو ادب'' کا ڈیکلریشن حاصل کرنے کی درخواست لکھی گئی ہے۔

تب۔ اور سعادت بھائی اگر ''کھول دو'' درمیان میں حائل نہ ہوتا تو حسن عسکری حکومت کے اس اقدام کو سراہتے نہ تھکتے۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ منٹو بھی، خود تھا اور اس لیے خود عسکری کا مفاد الجھ گیا تھا۔ کوئی پوچھے کہ عسکری صاحب! یہ فقرہ آپ نے کس کی خاطر کہا تھا کہ قوم کو ادب اور ادیبوں سے پانچویں کالم کی طرح نمٹنا پڑے گا؟ اب ''قوم'' ان سے نمٹی ہے تو آپ نے ان کے تحفظ کا علم یوں بلند کر دیا؟ خلوت میں بیٹھ کر مسکرائیے اور کسی فاشسٹ فن کار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کیجئے کہ جو کچھ ہوا خوب ہوا۔

دراصل تقسیم کے بعد ہمارے ہاں اچھے اور نامور فن کاروں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ جو چند ایک ہیں ان میں آپ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس بنا پر حسن عسکری کو اچانک آپ کی فنی عظمت کا شعور و الہام ہوا اور انہیں پتہ چلا کہ منٹو تو بہت اچھا افسانہ نگار ہے۔ اور آپ نے جانے یکایک کیسے مان لیا کہ حسن عسکری تو پاکستان کا بہت ہی بڑا نقاد ہے---- لطف یہ ہے کہ اس تعریف و توصیف کے بیچ وسط میں رسالہ ''اردو ادب'' خیمہ زن ہے جس کو آپ دونوں مرتب کر رہے ہیں---- منٹو اور عسکری---- زندگی اور خوابیدگی---- آگ اور پانی!

بڑا [illegible] گا بھائی---- آپ حسن عسکری کو راہ راست پر لانے نکلے تھے مگر ان کے فنی باغیچے میں مصنوعی پھولوں کی تزک بھڑک دیکھ کر اپنی راہ ہی سے دور ہٹے جا رہے ہیں۔ میں تو تصور تک نہیں کر سکتا کہ آپ کو بھی کسی دوسری شخصیت میں گھل مل کر غائب ہو جانا آتا ہے۔ مجھے حسن عسکری سے کوئی بیر نہیں۔ میرے دل میں ان کی سنجیدگی اور علمی قابلیت کی عزت ہے۔ چار پانچ برس تک ہمارے درمیان نہایت باقاعدہ خط و کتابت بھی رہی ہے اور ان میں ہم نے ایک دوسرے کو گالیاں نہیں دیں بلکہ علمی و ادبی بحثیں کی ہیں۔ وہ ترقی

ٹھنٹھ پر بیٹھے کیوں اونگھ رہے ہیں۔ یہی تو ترقی پسندی ہے۔ اسی کے تو آپ علمبردار ہیں' اور اب آپ کو ترقی پسندی کے نام تک سے چڑ ہے----''اُردو ادب'' میں آپ صرف اُردو ادب درج کرنا چاہتے ہیں' مگر خالص اُردو ادب تو انہی تاثرات کا اظہار ہوگا جو حسن عسکری نے اوپر کے الفاظ میں نمایاں کیے ہیں۔ اور اسی کو ترقی پسندی کہا جاتا ہے۔ آخر اس دوغلی پالیسی کا مطلب کیا ہے؟ حسن عسکری صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ پاکستان کے ادبی ڈکٹیٹر بننا چاہتے ہیں (اور یہ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے) اور ادب برائے ادب کے نقارے پر تعمیر پاکستان یعنی ترقی پسندی کی چوب بہت بھونڈا شور پیدا کرتی ہے۔

سعادت بھائی' میں آپ کو بہت برس سے جانتا ہوں۔ آپ کے خلوص کا معترف اور آپ کی صاف دلی کا مداح ہوں۔ مجھے آپ کی فنی عظمت سے بھی انکار نہیں۔ لیکن بحیثیت ایک ادیب کے آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الفاظ کے الٹ پھیر اور منطق کی بھول بھلیوں میں نہ الجھیے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک آتشیں قلم اور آپ کے ذہن میں ایک شدید جذبہ ہے۔ اس جذبے اور اس قلم کا خوشگوار تعاون آپ کو جبھی میسر آ سکتا ہے جب آپ زندگی کے عکاس اور باغی رہیں (جیسا کہ آپ اب تک ہیں)۔ آپ کی ذات سے پاکستان کو ان گنت توقعات ہیں۔ اس تعمیری دور میں ادب برائے ادب کی دلدلوں سے بچیے۔ ''اُردو ادب'' ضرور نکالیے مگر ایک معیّن نظریے کے ساتھ۔ حسن عسکری سے ضرور تعاون کیجیے مگر ان کے نظریات کو مشرف بہ زندگی کرنے کے بعد---- اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی جن سرگرمیوں سے آپ کو شکایت ہے' ان کا برملا اظہار کیجیے۔ انجمن کی اصلاح کا بیڑا اٹھایئے۔ ساحل پر بیٹھ کر ملاحوں کے ڈوبنے کا نظارہ کرنے والوں سے یہ کہیے کہ بعض اوقات طوفانی موجیں ساحل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ہمارے قریب آیئے اور اس ترقی پسندی کو سہارا دیجیے
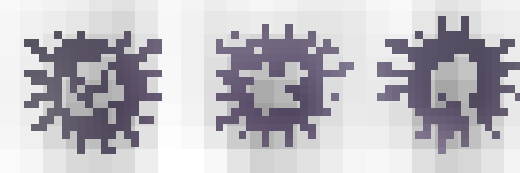
# ن۔م۔ راشد

یہ ۱۹۳۰ء۔۳۱ کا ذکر ہے جب میں گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب فضل الٰہی چشتی تھے جو نامور شاعر ن۔م۔راشد کے والد تھے۔ اُن دنوں راشد صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں شاید ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ جب بھی وہ اپنے والدین سے ملنے شیخوپورہ آتے، ہماری کلاس میں ضرور تشریف لاتے اور ہمیں انگریزی کا سبق دیتے۔ سب لڑکے ان کی شخصیت سے متاثر تھے۔ ویسے تو اپنے والد صاحب کی طرح ان کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا مگر ان کا اونچا قد، مناسب ناک نقشہ اور تک سک سے درست لباس ان کی شخصیت کی دلآویزی میں مزید اضافہ کرتا تھا۔ یوں بھی میٹرک میں پڑھنے والے بچوں کا ایم۔اے اور وہ بھی (شاید) ایم۔اے انگریزی میں پڑھنے والے جوانِ رعنا سے مرعوب ہونا قدرتی تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ ان کے نہایت سخت گیر ہیڈ ماسٹر صاحب کے صاحبزادے تھے۔

ان کی سخت گیری کی ایک ہلکی سی جھلک یہ ہے کہ وہ ہمیں الجبرا جیومیٹری پڑھاتے تھے۔ ایک روز تختۂ سیاہ پر انہوں نے کھریا مٹی سے ایک مثلث بنائی۔ پھر اس کے زاویوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک لمبے کوٹ کے ڈسٹر اٹھا کر تختۂ سیاہ

کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہہ کر میرے ہم جماعت کی سزا معاف کرا دیں۔۔۔۔ میں نے انہیں اس کی گستاخی کی نوعیت اس خوف سے نہ بتائی کہ آخر وہ بھی تو مجسٹریٹ ہیں' کہیں وہ بھی راشد صاحب کی طرح گستاخی کی سزا کو ضروری نہ قرار دے ڈالیں۔۔۔۔ بہرحال انہوں نے کچہری جاتے ہوئے رک کر محترم چشتی صاحب سے اس طالب علم کی سفارش کر دی اور اسے معافی مل گئی۔ میں نے بعد میں اپنے ایک ہم جماعت سے سنا کہ وہ میٹرک پاس کرنے کے بعد پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔

راشد صاحب سے میری دوسری ملاقات محترم اختر شیرانی کے گھر اور دفتر' واقع فلیمنگ روڈ (لاہور) میں ہوئی۔ ابتدا میں راشد صاحب' اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے بہت متاثر تھے اور ان کے ہاں اکثر حاضر رہتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ راشد ہی نے اختر شیرانی کو سانیٹ لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ اختر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ میری حیثیت ایک نوآموز کی تھی مگر جب میں نے ان سے شیخوپورہ سکول کا ذکر کیا تو ہنسے اور مجھ سے یوں گفتگو کی جیسے ہم دونوں برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اُن دنوں بھی راشد صاحب خاصے خوش پوش نظر آتے تھے۔ الفاظ کے تخلیقی استعمال پر بہت زور دیتے رہے اور کہتے رہے کہ شاعر جس زبان میں شاعری کرتا ہے' اسے اس زبان کی نزاکتوں سے ضرور آگاہی ہونی چاہیے۔

راشد کے والد جناب فضل الٰہی چشتی ضلع سرگودھا میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر فائز تھے۔ اب تو میرا گاؤں ضلع خوشاب میں شامل ہے مگر ان دنوں پورا علاقہ سون سکیسر ضلع سرگودھا ہی کا حصہ تھا اور گرمیوں کے موسم میں اضلاع سرگودھا' کیمبل پور اور میانوالی کے اعلیٰ حکام کچھ عرصہ سکیسر پہاڑ پر گزارنے آتے تھے جو ایک طرح سے ان اضلاع کا گرمائی صدر مقام تھا۔ شاید

چشتی صاحب بھی ساتھ آئے ہوئے تھے۔ میں اپنے گاؤں لنگہ میں تھا جب مجھے اطلاع ملی کہ چوہدری راشد صاحب تشریف لائے ہیں۔ میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ میں لپک کر باہر آیا۔ راشد صاحب اور ان کے ہمراہ آئے ہوئے قریشی مرید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں بالاخانے میں بٹھایا اور خود میں امی سے جا کر عرض کیا کہ جگ میں بہت ٹھنڈے گھڑے میں سے پانی لے کر شربت بنا دیجئے کہ میرے دوست اتنی تیز دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے مجھ تک پہنچے ہیں۔۔۔ اور جب میں جگ لیے بالاخانے پر آیا اور گلاس میں شربت ڈالنے لگا تو راشد صاحب بولے۔۔۔ "چوہان تو مجھے یقین ہے کہ تیز دھوپ میں تین چار میل پیدل چل کر آیا ہوں مگر میں آپ کو ایک گلاس کی ایک چونی پیش کروں گا کہ حضرت علامہ صاحب کا یہی حکم ہے!"

میں چونی کا ذکر سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ راشد صاحب خاکسار تحریک میں شامل ہیں اور علامہ مشرقی کے پیروکار ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ راشد صاحب! یہ میرا گھر ہے اور میں نے شربت کی دکان نہیں کھول رکھی ہے۔ فرمایا "علامہ صاحب کا یہی حکم ہے کہ کسی مسلمان بھائی پر کسی صورت میں بوجھ نہ بنو۔ اس کا پانی پیو یا کھانا کھاؤ تو اس کے دام ضرور ادا کرو چنانچہ میں پانی کے اس گلاس کے دام ضرور ادا کروں گا۔"

راشد صاحب کے ہمراہ علاقے کے ایک گاؤں مردوال کے قریشی مرید احمد تھے جو ان دنوں سکول میں ٹیچر تھے مگر زبردست مقرر تھے اور بعد میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے تھے۔ ان سے میرا پرانا تعارف تھا۔ میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "راشد صاحب علامہ صاحب کے حکم کے سخت پابند ہیں۔ میرے ہاں کھانا کھایا ہے مگر اس کا ایک روپیہ ادا کر دیا ہے۔ ان کے اصرار پر مجھے ایک روپیہ قبول کرنا پڑا۔ آپ بھی چونی لے لیجئے۔"

میں نے عرض کیا کہ میرے ضمیر کے لیے تو یہ چونّی کلنک کا ٹیکا بن کر رہ جائے گی اس لیے میں آپ دونوں اصحاب سے دست بستہ منت کرتا ہوں کہ پانی پی لیجیے۔ راشد صاحب نے چونّی دیے بغیر اور قاضی صاحب نے راشد صاحب کی خاطر پانی پینے سے انکار کر دیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے پیاسے تشریف لے گئے۔

میں ۱۹۳۹ء میں محکمۂ آبکاری میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گیا۔ میں ملتان میں متعین تھا جب ایک روز میں نے راشد صاحب کو کچھ دور ایک تانگے سے اترتے اور اپنی طرف آتے دیکھا۔ مجھے نہایت مسرت بخش حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ "اوور ایج" ہونے سے بچنے کے لیے وہ ملتان ڈویژن کے کمشنر کے دفتر میں کلرک بھرتی ہو گئے ہیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ ملتان میں چند روز ساتھ رہے گا مگر شاید جلد ہی انہیں محترم پطرس بخاری کے توسط سے آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی اور وہ ملتان میں زیادہ نہ رک سکے۔ ان دنوں بخاری صاحب کی برکت سے معروف نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو ریڈیو کے محکمے میں دھڑا دھڑ بھرتی کیا جا رہا تھا چنانچہ راشد کے علاوہ کرشن چندر، منٹو، اوپندر ناتھ اشک، میرا جی، ممتاز مفتی اور اشوامترا عادل وغیرہ کے علاوہ مولانا چراغ حسن حسرت بھی آل انڈیا ریڈیو کے عملے میں شامل تھے۔

میں تاریخیں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت کوتاہ ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ۱۹۴۱ء کے آس پاس کا ذکر ہے کہ دہلی ریڈیو میں جدید نظم گوؤں کا ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، میرا جی، روش صدیقی، اسرار الحق مجاز اور چند دوسرے شعرا کے علاوہ میں نے بھی شرکت کی۔ میں منٹو کے ہاں ٹھہرا جو اس زمانے میں وہاں سکرپٹ رائٹر تھا۔ میں نے اپنی نظم "نیا سازِ نئی تان" پڑھی جو میرے پہلے مجموعۂ کلام "جلال و جمال" میں شامل ہے۔ یہ نظم چار چار مصرعوں

ہے ۳ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا پہلا اور چوتھا مصرع اور اسی طرح ہر بند کا
دوسرا اور تیسرا مصرع ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں۔ داد تو مجھے ملی مگر منٹو
نے یہ غضب ڈھایا کہ (شاید بسلسلہ دوست نوازی یا مہمان نوازی) مشاعرے
کے فوراً بعد اس نے اپنی تیز آواز میں اعلان کر دیا کہ ندیم کی نظم مشاعرے میں
پڑھی جانے والی باقی سب نظموں سے بدرجہا بہتر اور خوبصورت رہی۔ اس پر
بیشتر شعرا مسکرا دیے مگر راشد غصے میں آ گئے۔ ان کے چہرے کا تاثر واضح طور پر
اعلان کر رہا تھا کہ منٹو مبالغہ کر رہا ہے۔ منٹو کی تیز نظروں نے راشد کے غصے کو
بھانپ لیا چنانچہ منٹو نے اسے وہیں سب کے سامنے بازو سے پکڑ کر کہا "یوں
منہ کیوں بنا رہے ہو راشد! تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں مگر
کیا اس مشاعرے میں ندیم کی نظم سے بہتر کوئی نظم پڑھی گئی؟ اگر پڑھی گئی تو وہ
دوسروں کی نظم ہے؟ بہرحال یہ واضح کر دوں کہ تمہاری نظم تو بالکل نہیں ہے۔" اس
پر ایک قہقہہ پڑا اور راشد نے بھی بادل نخواستہ اس قہقہے میں مسکراہٹ کی حد تک
شمولیت کرنا مناسب سمجھا اور پھر کہا تو صرف اتنا کہ یہ شخص کہیں بھی شرارت
سے باز نہیں آتا۔

میں اس کے بعد بھی دو بار دہلی گیا اور خواہ مخواہ منٹو کے ہاں ٹھہرا۔
جب منٹو صاف ستھرے لباس میں ایک ہاتھ میں چھڑی اور ٹوپ پہنے دوسرے
ہاتھ میں چرمی تھیلا لیے (جس میں اس کے مسودات ہوتے
تھے) ریڈیو سٹیشن جاتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ وہاں اس کی شوخی اور حاضر
جوابی سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک کے علاوہ راشد کو
بھی چھیڑتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں ریڈیو سٹیشن کے ایک کمرے میں منٹو کے
پاس بیٹھا تھا کہ راشد وہاں کسی کام سے آئے۔ مجھے دیکھ کر مصافحے کے لیے
آگے بڑھے۔ چند قدم چلے ہوں گے تو منٹو نے کہا "سلام علیکم مولانا"۔ راشد آگے

موضوعات پر کیوں لکھتے ہو جن کا تمہیں پوری طرح تجربہ نہیں ہوتا۔ مثلاً تم نے ایک نظم میں کہا ہے کہ ''اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں'' وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی ہم رقص کے ساتھ رقص کیا ہے؟ ہمارے مشرق میں، تو عورت اور مرد کا آپس میں چپھا ڈال کر رقص کرنے کا رواج نہیں۔ تو کیا تم نے مغرب کی کسی عورت کے ساتھ رقص کیا ہے؟ کیا تمہیں مغربی رقص کے Steps آتے ہیں؟ مجھے آتے ہیں۔ ادھر آؤ۔ میرے ساتھ رقص کر کے دکھاؤ۔۔ سارا پول کھل جائے گا۔''

راشد نے نہایت GRIM ہو کر کہا ''منٹو کبھی تو سنجیدگی سے بھی کوئی بات کر لیا کرو۔''

اور منٹو بولا ''تو کیا یہ سب میں نے غیر سنجیدہ گفتگو کی ہے؟ میں تو نہایت سنجیدگی سے عرض کر رہا ہوں کہ جس چیز کا تجربہ نہ ہو سے شاعری کا موضوع نہ بنایا کرو، سمجھے؟''

اور راشد نہایت ناگواری سے واپس چلے گئے۔

دہلی کے ایک سفر میں منٹو نے مجھے بتایا کہ ''فیض احمد فیض صاحب ایم اے او کالج امرتسر کے چند طلبا کو علی گڑھ یونیورسٹی دکھانے لے جا رہے ہیں ور دہلی میں ایک دن کے لیے رُکے ہیں۔ آج شام میں نے انہیں ایک ڈرنک پارٹی میں مدعو کیا ہے۔ تم تو بدنصیب ہو کہ ڈرنک ورنک نہیں کرتے مگر تمہیں میرے ہمراہ اس پارٹی میں شامل ہونا ہوگا۔'' ظاہر ہے میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ کسی ہوٹل میں، جس کا نام یاد نہیں، یہ پارٹی برپا ہوئی۔ کم و بیش پندرہ بیس اصحاب مدعو تھے۔ منٹو کے اور میرے علاوہ فیض، راشد، بیدی، کرشن، میرا جی، اشک، ممتاز مفتی، حفیظ جاوید، دو چار اور شعرا (جن کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں) اور مولانا چراغ حسن حسرت اس محفل میں شامل تھے۔ شرب و نوش کا آغاز ہوا تو میں نے

مولانا حسرت نے فرمایا کہ غزل کا ایک دور ہو جائے۔ اس پر منٹو نے کہا کہ نہیں۔ اب نظم چلے گی۔ مولانا نے کہا کہ نہیں غزل ہو گی۔ منٹو نے اصرار کیا کہ ہو گی تو نظم ہو گی ورنہ کچھ نہیں ہو گا۔ میں اس لڑائی کی تفصیل منٹو پر اپنے مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں۔ اس اختلاف رائے کا نتیجہ اس مضمون میں تفصیل سے درج ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے دنوں میں راشد بھی فیض وغیرہ کی طرح انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر شاید کپتان کہلانے لگے۔ جوش ملیح آبادی نے ان اہل فن کی اس حیرت انگیز قلابازی کی شدید مذمت کی اور ایک بھرپور نظم لکھی جس کا عنوان "چند روز اور" فیض کی نظم ہی سے لیا گیا تھا۔ اس نظم میں جوش نے انگریز کی فوج میں بھرتی ہونے والوں کی جی کھول کر تضحیک کی تھی۔ میں ان دنوں رسالہ "ادب لطیف" کا مدیر تھا۔ جوش صاحب نے نظم "ادب لطیف" میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ اس نظم کی اشاعت سے راشد، فیض، تاثیر وغیرہ کو مجھ سے شدید شکایت ہوتی۔ میں نے سوچا اس نظم کی نقل ان سے بھیجوں اور یہ نظم ان شعراء کے ردعمل کے ساتھ رسالے میں درج کر دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا مگر ان حضرات نے چپ سادھ لی۔ [illegible] "[illegible]" کے [illegible] میں نے نظم کی اشاعت روک لی۔ اس نظم کا مفصل [illegible] فیض سے متعلق اپنے مضمون میں کیا ہے۔

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ "ادب لطیف"، "چھایا" اور "تہذیب نسواں" کی ادارت کے [illegible] نوجوانی کے جوش و خروش میں تنقید، غزل، نظم، افسانہ اور مزاح وغیرہ تخلیق کرنے کے شوق میں تھکن سے چور ہو کر ایک طرح اعصابی زدگی کا شکار ہو گیا اور اپنے گاؤں گجرات میں اپنی ماں کی پناہ میں چلا گیا۔ جب صحت بحال ہونے لگی تو مجھے برادر محترم سید سرور نیازی کی طرف سے [illegible] کہ پشاور ریڈیو

کم سے کم سات ایسے اشعار ازبر ہونے چاہئیں جو واقعی اچھے اور معیاری اشعار ہوں۔ انصار ناصری اور قدوس یہاں موجود ہیں۔ اب فراق کے سات شعر سنائیے۔ اچھے ہوئے تو یہ اصحاب ان کی داد دیں گے ورنہ خاموش رہیں گے۔ چلیے سنائیے سات شعر۔"

سات کیا' اُس زمانے میں تو مجھے فراق کے ستر عمدہ اشعار یاد تھے' سو میں نے سات شعر سنائے تو حاضرین نے ہر شعر پر کھل کر داد دی۔ تب میں نے راشد صاحب سے عرض کیا کہ "یہی کسوٹی حفیظ جالندھری کے سلسلے میں بھی استعمال ہونی چاہیے چنانچہ راشد صاحب! اب آپ حفیظ صاحب کی غزل کے سات بھرپور شعر سنائیے۔"

راشد صاحب اس پر تیار ہوگئے۔ انہوں نے بسم اللہ اس شعر سے کی:

کشتی خدا پہ چھوڑ کے' بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں

میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے "راشد صاحب! اس شعر میں لفظ "پھینک" کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔"

اس پر راشد صاحب ایک دم بھڑک اٹھے۔ بولے "میں تنقید کے اس انداز کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے باقی اشعار نہیں سناؤں گا۔" پھر وہ اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔ مجھے ان کی اس حد تک کی زود رنجی کا علم نہ تھا۔ افسوس ہوا کہ انہوں نے میری (بزعم خویش) "شگفتگی" کا برُا مانا۔

ریڈیو سٹیشن کے سٹاف کی ایک میٹنگ میں کسی صاحب نے تجویز پیش کی کہ اردو کے نئے افسانہ نگاروں کے افسانے ان کی اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے نشر کرنا چاہئیں۔ میں نے اس تجویز کی تائید کی۔ افسانہ نگاروں کے نام تجویز ہونے لگے تھے تو راشد صاحب نے میری منہ بولی بہنوں خدیجہ مستور اور ہاجرہ

ہو گا۔ راشد صاحب نے فرمایا کہ میں حمید اختر کو پشاور بلا لوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ پشاور میں میرے ہاں تشریف لائے تو میں انہیں ساتھ لے کر راشد صاحب کے پاس پہنچا۔ تب میں نے ن م ۔ راشد کی شخصیت میں سے ایک اور ایسی شخصیت برآمد ہوتے دیکھی جسے میرا ذہن آج بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

میں نے حمید اختر کا تعارف کرایا۔ راشد صاحب بولے ''اچھا تو یہ ہیں ''۔۔۔ میں نے کہا ''جی ہاں'' بجائے اس کے کہ راشد صاحب' حمید اختر سے ہاتھ ملاتے اور انہیں کرسی پر بیٹھنے کو کہتے' بولے ''یہ آج کے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کا اداریہ ہے۔ اس کا ترجمہ کر دیجئے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''راشد صاحب! یہ مترجم نہیں ہیں' تخلیق کار ہیں۔ پھر مترجموں کا براڈ کاسٹنگ میں کیا کام۔ میں نے آپ سے ان کا مکمل تعارف کرا دیا تھا۔ انہیں موعودہ جاب دیجئے۔ اور پھر آپ نے ابھی تک انہیں کرسی پر بیٹھنے تک کو نہیں کہا جبکہ یہ میرے اور آپ کے مہمان ہیں۔'' راشد صاحب نے میری باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور فرمایا ''ترجمہ تو انہیں کرنا پڑے گا۔'' میں نے دوبارہ کہا کہ میں ان کے بارے میں تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔ نیازی صاحب نے بھی آپ سے بات کی ہو گی۔ ان کی تعیناتی کا فیصلہ فرمائیے اور قصہ ختم کیجئے۔'' راشد صاحب نے اسی GRIM لہجے میں کہا ''ترجمہ تو انہیں کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''راشد صاحب! مجھے آپ سے ایک Stiff- Colored Bureocrat کے سے برتاؤ کی توقع نہیں تھی۔ میں حمید اختر کو معذرت کے ساتھ واپس لاہور بھیجے دیتا ہوں مگر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ سراسر غیر مہذب اور غیر شاعرانہ رہا۔ خدا حافظ۔'' بولے ''خدا حافظ'' اور قصہ ختم ہو گیا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ راشد صاحب نے ایک نوجوان ادیب سے اور پھر

میں نے روزنامہ ''امروز'' کی ادارت سے مستعفی ہونے کے بعد ۱۹۶۳ء میں رسالہ ''فنون'' نکالا تو راشد صاحب کو بھی خط لکھا کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں۔ غالباً وہ اُن دنوں ایران میں تھے۔ انہوں نے نظم تو بھیجی مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا معاوضہ کراچی میں میری بیٹی کو بھجوا دینا کیونکہ میں معاوضے کے بغیر کسی رسالے کو کلام نہیں بھجواتا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اس دوران میں ''فنون'' کی کسی اشاعت میں پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کا ایک مضمون' جو نئے شاعروں کے بارے میں تھا' درج ہوا۔ اتفاق سے فیض' راشد اور میراجی کے علاوہ انہوں نے میرا ذکر بھی کیا تھا۔ اس پر راشد صاحب نے مجھے لکھا کہ آپ اپنے رسالے میں اپنی ہی تعریف چھپواتے ہیں تو کیا آپ نے یہ رسالہ اپنی تشہیر کے لیے جاری کیا ہے؟ میں نے تفصیل سے جواب عرض کیا کہ شعر میں بھی کہتا ہوں۔ اگر کسی مضمون میں میرا ذکر آ جائے تو میں کیا کروں۔ اس کے بعد وہ کئی بار لاہور تشریف لائے مگر ایک بار بھی مجھے مطلع نہ کیا۔ شاید وہ کسی وجہ سے مجھ سے کچھ زیادہ ہی خفا ہو گئے تھے۔

تب رسالہ ''افکار'' کراچی کا ضخیم ''ندیم نمبر'' شائع ہوا جس میں انہوں نے ترقی پسند ادب کے حوالے سے بعض باتیں ایک بڑے فنکار کے معیاروں سے خاصا نیچے اتر کر کی تھیں۔ اس پر ان کے بعض دوستوں نے انہیں لکھا کہ آپ نے یہ کیا جھک ماری ہے۔ چنانچہ راشد نے انتقال سے شاید ایک آدھ ماہ پہلے ''افکار'' ہی میں معاملہ صاف کر دیا اور میری شاعری کی تعریف مبالغے کی حد تک کر دی۔ انہوں نے یہ تک لکھا کہ جس شاعری کا inspiration ندیم پر اترا وہ دراصل مجھ پر اترنا چاہیے تھا! معاف کر دینے والوں میں مجھے ''فرسٹ کلاس'' حاصل ہے اس لیے معاملہ برابر ہو گیا مگر افسوس کہ اس خط کی اشاعت کے بعد راشد زیادہ دیر نہ جی سکے۔

اور اس قسم کی پاک و منزہ بلکہ معصوم شاعری کرنا بہت بڑی ہمت کی دلیل ہے۔ بے شک ان کے کلام میں بعض دفعہ شعر اور صحافت ساتھ ساتھ برخوردار بستہ بن کے بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اس سے کسے مفر ہے۔ ہم سب کے پیشے اکثر ہمارے فن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ قاسمی صاحب ہی کو کیوں الزام دیا جائے۔ مجھے ان کی طرف سے سب سے بڑی بے اطمینانی اس وجہ سے رہتی کہ وہ پُرگو واقع ہوتے ہیں۔ پُرگوئی باتونی پن کی طرح اکثر آدمی سے کم درجے کی باتیں کہلوا دیتی ہے۔ لیکن آپ نے یہ تو بہت ہی اچھا کیا کہ ان کے چاروں مجموعوں کا ایک جامع انتخاب شائع کر دیا۔ ہم میں سے اکثر اپنے کلام کے انتخاب کی برکتوں سے صرف نظر کر دیتے ہیں۔ غالب نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کا وہ پہلا دیوان ہی جو اس کے کلام کے انتخاب سے زیادہ نہ تھا' اس کی عالمگیر عزت اور رفعت کا باعث ہوا ہے۔ اس انتخاب کو میں کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں ور ہر بار قاسمی صاحب کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھتی چلی گئی ہے۔ ایران میں بعض شیعہ حضرات کا یہ ایمان ہے کہ قرآن دراصل حضرت علیؑ پر نازل ہونے والا تھا لیکن فرشتے کی غلطی سے حضرت محمدؐ کے ہاتھ لگ گیا! چنانچہ مجھے بھی یہ انتخاب پڑھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ یہ وحی خود مجھ پر نازل ہونے والی تھی۔ لیکن ہاتف کی غلطی سے (غلط بخشی سے نہیں) قاسمی صاحب پر نازل ہوگئی! قاسمی صاحب مجھے معاف فرمائیں۔

***

تھی۔ مولانا سالک صاحب یا ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا جو مصافحے سے آگے نہ بڑھا کیونکہ فیض صاحب کے ساتھ ان کے احباب کا جو ہجوم تھا' وہ انہیں دور کھینچ لے گیا۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ آل انڈیا ریڈیو نے ''جدید شعرائے اُردو'' کا ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا تھا اور مجھے بھی بلا بھیجا تھا۔ میں سال یاد رکھنے کے سلسلے میں نہایت درجہ کوتاہ ہوں' مگر بہرحال اس مشاعرے کا انعقاد ۱۹۴۰ء -- ۱۹۴۱ء میں کسی تاریخ کو ہوا تھا۔ میں ملتان میں سب انسپکٹر محکمہ آبکاری متعین تھا۔ وہاں سے دہلی آیا۔ اپنے عزیز دوست سعادت حسن منٹو کے ہاں قیام کیا۔ منٹو اس زمانے میں دہلی ریڈیو سٹیشن سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک تھے۔ مشاعرے کے سب شرکا کے نام تو یاد نہیں' مگر جو یاد ہیں وہ یہ ہیں'

----فیض احمد فیض' ایم ڈی تاثیر' تصدق حسین خالد' حفیظ جالندھری' ن۔م۔راشد' روش صدیقی' میراجی' اسرار الحق مجاز وغیرہ۔ میں عمر میں ان سب شعرا سے چھوٹا تھا مگر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منٹو نے ان بڑے شعرا کے ہجوم میں اعلان کیا کہ ندیم کی نظم آپ سب شعرا سے بہتر تھی۔ یہ کہہ کر منٹو نے سراسر زیادتی کی تھی مگر اسے اپنی بات کہنے سے کون روکتا۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا ردعمل تھا۔ فیض صاحب منٹو کا یہ اعلان سن کر مسکراتے رہے اور ن۔م۔راشد یہ کہہ کر رہ گئے کہ یہ شخص کسی بھی مقام پر شرارت سے باز نہیں آتا۔

ان دنوں اُردو ہندی کا لسانی جھگڑا اوج پر تھا۔ منٹو کو ایک عجیب شرارت سوجھی۔ اس نے سب شعرا کو جمع کر کے کہا کہ آپ لوگ ایک ایک ایسی نظم لکھیے جو نہ اُردو میں ہو نہ ہندی میں۔ بلکہ کسی بھی زبان میں نہ ہو۔ آپ لوگوں کا لہجہ اور اسلوب بولے۔ بے معنی گھڑے ہوئے لفظوں کے آہنگ ہی سے سامعین اندازہ لگا لیں گے کہ یہ فیض کی نظم ہے اور یہ راشد کی اور یہ پندرناتھ اشک کی۔

آغاز میں لکھنؤ سے میری عزیز منہ بولی بہنیں، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اپنے جملہ عزیزوں کے ہمراہ لاہور آ چکی تھیں۔ میں نے پشاور سے لاہور آ کر انہیں متروکہ مکان الاٹ کرانے میں مدد دی اور پھر میں پشاور کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لاہور آ گیا۔ لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مجھے فوراً انجمن کی پنجاب شاخ کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ میں نے انہی دنوں بہن ہاجرہ مسرور کی معیت میں رسالہ ''نقوش'' جاری کیا جس میں دیگر معروف اہل قلم کے علاوہ فیض صاحب کی نگارشات بھی شامل رہیں۔ انجمن کے ہفتہ وار تنقیدی جلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ میں نے ایک اجلاس میں علامہ اقبال پر ایک مفصل مضمون پڑھا جس میں علامہ کی سامراج دشمنی، مُلائیت دشمنی اور جاگیردارانہ معیشت کی واضح مخالفت کے اعتراف و تحسین کے ساتھ ہی علامہ کے بعض پہلوؤں پر گرفت بھی کی تھی۔ اتفاق سے فیض اس اجلاس میں موجود تھے۔ میرے مضمون کے ختم ہوتے ہی وہ ناگواری بلکہ غصے کے واضح تیوروں کے ساتھ بولے اور میرے مضمون کے اس حصے کی شدید مخالفت کی جس میں میں نے علامہ کی بعض سرگرمیوں پر گرفت کی تھی۔ ان کی مخالفت تو مبارک تھی مگر مجھے عمر بھر یہ افسوس رہا کہ فیض صاحب نے میرے دو تین اعتراضات کا کوئی جواب دینے کی زحمت نہ کی بلکہ زیادہ زور اس نکتے پر دیتے رہے کہ شعر و ادب کی بڑی شخصیتوں کی شہرت کار کردگی کے اعتراف کے بعد ان کی بعض منفی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ یہ ساری بحث کسی رسالے یا اخبار میں شائع بھی ہوئی تھی مگر افسوس کہ مجھے اس رسالے یا اخبار کا نام یاد نہیں۔ علامہ کے بارے میں میرے اس مقالے کے خلاف روزنامہ ''احسان'' کے مدیر وحید بزمی (مرحوم) نے دو روز تک طویل طویل اداریے لکھے تھے اور مجھے بہت بری طرح گردن زدنی قرار دیا تھا۔

جاتی تھی۔ جب نومبر ۱۹۴۹ء کی کانفرنس کے سلسلے میں انجمن کے نئے منشور اور کانفرنس میں پیش کی جانے والی قراردادوں پر بحث مباحثے کے لیے ترقی پسند مصنفین مل بیٹھتے تھے تو فیض صاحب ان محفلوں میں شاذ ہی شرکت کرتے تھے۔ اسی کانفرنس میں اُس قرارداد کو بھی پیش ہونا تھا جس کا مضمون غیرترقی پسند ادیبوں کے بائیکاٹ پر مشتمل تھا' اور وہ مفصل منشور بھی منظور ہونا تھا جو انتہا پسندی کا شاہکار تھا' مگر فیض صاحب نے ان میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ البتہ جب کانفرنس کے اجلاسوں کے لیے کسی ایک صدر کی بجائے ایک ''پریزیڈیم'' کا فیصلہ ہوا تو فیض صاحب مان گئے اور وہ کانفرنس کی سب نشستوں میں مُطلبی فرید آبادی' ممتاز حسین' فارغ بخاری' ریاض روفی اور میرے پہلو بہ پہلو بیٹھتے رہے۔ جب کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا اور مجھے جنرل سیکرٹری قرار دیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض صاحب اور مُطلبی صاحب کے سے سینئر حضرات کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لیے نامزد نہ کیا جائے۔ مگر اکثریت نے میری گزارشات پر توجہ نہ دی۔ البتہ میں نے اعلان کیا کہ ''ہم فیض صاحب کو بھاگنے نہیں دیں گے۔'' چنانچہ انہیں انجمن کا وہ ''خزانچی'' منتخب کیا گیا جس کی تحویل میں انجمن کا نہ صرف ایک روپیہ تک نہیں تھا بلکہ قرضہ ہی قرضہ تھا۔

گرمیوں کا آغاز تھا۔ میں نسبت روڈ کے مکان کی تیسری منزل کی چھت پر پڑا سو رہا تھا جب گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ اُن دنوں پولیس خانہ تلاشیوں اور گرفتاریوں میں بہت مصروف رہتی تھی۔ میں نے سوچا ایسا ہی کوئی سانحہ ہونے کو ہے۔ نیچے جا کر دروازہ کھولا تو فیض صاحب' سبط حسن صاحب (امپیریل الیکٹرک کمپنی کے) رحمن صاحب (اور شاید حمید اختر صاحب بھی) موجود تھے۔ میں نے سب سے مصافحہ کیا اور بیٹھک کا دروازہ کھولنے لگا تو فیض صاحب بولے ''نہیں ندیم صاحب' اس کی ضرورت نہیں ہے۔

کیس کے تحت گرفتار کر لیے گئے اور مئی ۱۹۵۱ء میں ملک کے دونوں حصوں سے کتنے ہی ترقی پسند مصنفین کو محض احتیاطاً نظر بند کر دیا گیا اور انجمن بے ٹھکانا ہو کر رہ گئی۔ نظر بندی کے دنوں میں جب ہم مل بیٹھتے تھے تو سوچتے رہ جاتے تھے کہ فیض صاحب کا سا نرم مزاج شاعر فوجی طاقت کے ساتھ حکومت کا تختہ الٹنے کا اقدام کیسے کر سکتا ہے۔

نومبر ۱۹۵۱ء میں رہا ہو کر میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے ایک اور کل پاکستان کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس دوران میں پورے ملک کی شاخوں کی تائید کے ساتھ وہ انتہا پسندانہ قرارداد واپس لے لی گئی جس میں بڑے بڑے اہل قلم کا بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ کل پاکستان کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس میں نہ صرف متذکرہ قرارداد باقاعدہ واپس لی گئی بلکہ منشور پر بھی نظرثانی کی گئی اور قریب قریب وہی منشور منظور ہو گیا جو انجمن کے آغاز میں مرتب ہوا تھا۔ اس کانفرنس کے تین اجلاس تھے جن کی صدارت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، مولانا عبدالمجید سالک صاحب اور پیر حسام الدین راشدی صاحب نے کی۔ اس کانفرنس میں بھی مجھے ہی جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا جبکہ میں نے ظہیر کاشمیری کا نام تجویز کیا تھا مگر ظہیر نے معذرت کر لی تھی۔

انہی دنوں فیض صاحب کا مجموعۂ کلام "دستِ صبا" جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا۔ فیض صاحب نے مجھے لکھا کہ میں مسودے پر ایک نظر ڈال لوں۔ میں نے بعض مقامات کے سلسلے میں شبہے کا اظہار کیا۔ فیض صاحب نے مجھ سے بعض شبہات دور کر دیے اور بعض مقامات کو جوں کا توں رکھا۔ کتاب شائع ہوئی تو اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت منشی محمد عبدالرحمن چغتائی صاحب نے فرمائی۔ میں نے فیض کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا اور اپنی وہ نظم بھی پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا

میں صرف میں اور پروفیسر صاحب رہ گئے تو میں نے گستاخانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے گھرک کر کہا کہ اگر اب آپ نے نلکے کے پانی کی پیش کش کی تو میں آپ کے دانت توڑ دوں گا۔ نشے میں دھت شرابیوں پر اس طرح کی دھمکی کوئی اثر نہیں کرتی مگر پروفیسر ایک دم متاثر ہوگئے اور ایسی چپ سادھ لی کہ فیض صاحب اور سبط حسن صاحب کے چھیڑنے پر بھی کچھ نہ بولے۔ دوسرے روز وہ صبح سویرے نسبت روڈ پر میرے غریب خانے میں تشریف لے آئے اور مجھ سے گذشتہ رات کی زیادتی کی معافی مانگی۔ میں نے انہیں سینے سے لگا لیا کہ بنیادی طور پر وہ ایک پیاری شخصیت تھے۔ نہ جانے انہیں یہ کیسے یاد رہ گیا کہ رات انہوں نے غلط حرکت کی تھی۔

میں ۱۹۵۳ء کے آغاز میں روزنامہ ''امروز'' کا مدیر مقرر ہوا اور جب فیض صاحب رہا ہوئے تو انہوں نے پھر سے ''پاکستان ٹائمز'' کی ایڈیٹری سنبھالی۔ ''امروز'' نے اپنی زندگی کے دس برس پورے کر لیے تھے اس لیے اس کا دو سالہ نمبر نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ اس سلسلے میں فیض صاحب نے اور میں نے ظہیر بابر، حمید اختر، حمید ہاشمی اور عبداللہ ملک کے مشوروں سے ایک منصوبہ بنایا اور ایسا یادگار نمبر مرتب کیا کہ بعض باذوق قارئین کے پاس اب تک محفوظ چلا آتا ہے۔

انہی دنوں جب مجھے معلوم ہوا اور فیض صاحب نے خود بھی اعتراف کیا کہ وہ پنجاب کے گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی کی تقریریں لکھتے رہے ہیں تو یہ بات بڑی مجھے باقاعدہ صدمہ پہنچا۔ اس سے پہلے انہوں نے برصغیر کی تاریخ کے سفاک ولین برطانیہ کی فوج میں کرنل کا عہدہ قبول کر کے اپنے چاہنے والوں پر ستم ڈھایا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہی تھا کہ فیض صاحب ملک کے حاکم انگریز کی فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں مگر مجھے اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب میں انہیں فوج کے پتے پر خط لکھنے بیٹھا۔ میں نے ان کا یہ پتہ اپنے نہایت عزیز دوست (اور

جسے جوش صاحب نے اپنے مفہوم میں استعمال کیا تھا۔ اس نظم میں فیض صاحب کے علاوہ تاثیر صاحب اور راشد صاحب وغیرہ کو جو انگریز کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ نشانۂ تضحیک بنایا گیا تھا۔ میں نے یہ نظم پڑھی تو سوچا کہ اگر یہ چھاپ دوں تو میرے یہ سب محترم دوست خفا ہو جائیں گے۔ سو میں نے اس نظم کی نقول تیار کیں اور سب کو بھجوا دیں کہ اگر آپ اس ضمن میں کچھ کہنا پسند کریں تو میں نظم کے ساتھ انہیں بھی شائع کر دوں گا۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی جواب کی ہمت نہ کی اور یہ نظم میرے دورِ ادارت میں شائع نہ ہو سکی (سنا ہے بعد میں شائع کر دی گئی تھی) نظم کا موضوع یہ تھا کہ شاعر کی بیوی اپنے میاں کو غیرت دلاتی ہے کہ آپ کے سب دوست انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر مزے اڑا رہے ہیں اور:

بیویاں ان کی لونڈر میں لبی رہتی ہیں
شیمپین پیتی ہیں، صوفوں میں دھنسی رہتی ہیں
ان کی زلفیں ہی نہیں مست و معطر پیارے
ان کے گالوں پہ بھی چربی کے ہیں چکر پیارے

اور شاعر بیوی کو تسلی دیتا ہے کہ:

چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز

نظم کے آخر میں شاعر اپنی بیوی کو سر عبدالقادر کی برپا کی ہوئی ایک دعوت میں شامل ہونے کا کہتا ہے:

اٹھ کھڑی ہو کہ ہے دعوت کا یہ موقع نادر
راستہ دیکھ رہے ہوں گے سر عبدالقادر

[illegible] سر عبدالقادر پر نشان لگا کر جوش صاحب نے مجھے یہ [illegible] نوٹ [illegible] تھا

اسے فیض صاحب کے پاس بھیج دیتا تھا کہ وہ مجھ سے سینئر بھی ہیں اور دفتر میں عموماً فارغ ہی بیٹھے ہوتے ہیں کیونکہ سال میں پاکستان ٹائمز کے دو چار ہی اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ فیض صاحب بھی ان نوجوانوں کو یہ کہتے ہوئے میرے دفتر کا راستہ دکھا دیتے تھے کہ میں تو انگریزی اخبار کا اڈیٹر ہوں اور انگریزی ہی میں سوچنے لگا ہوں۔ ندیم کے پاس جایئے کہ اُردو اخبار کا اڈیٹر ہے اور اسی لیے اُردو میں سوچتا ہے۔ جب ہم دونوں پر یہ راز کھلا کہ وہ نوجوانوں کو میری طرف اور میں انہیں فیض صاحب کی طرف روانہ کر دیتا ہوں تو ایک روز ہم دونوں نے مل کر ایک تجویز سوچی۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم صاحب تازہ تازہ ریٹائر ہوئے تھے اور سنت نگر میں رہائش پذیر تھے۔ طے پایا کہ شاگردی اور مشورے کے طالبوں کو صوفی صاحب کے ہاں بھجوایا جانا شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ ضرورت مندوں کو ہم نے صوفی صاحب کے گھر کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔ تین چار ماہ کے بعد ایک بار ہم دونوں کسی تقریب میں شامل ہونے پہنچے تو صوفی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سلام و آداب کے بعد میں نے پوچھا کہ قبلہ ریٹائرمنٹ کے بعد وقت کیسا گزر رہا ہے؟ بولے "ویسے تو کچھ ادھورے ادبی کام مکمل کرنے کا وقت مل گیا ہے مگر ایک پریشانی بہت شدید ہے۔ نوجوان اپنی ساری بچی غزلیں لے کر میرے پاس قطار اندر قطار آنے لگے ہیں اور ایک پل بھی چین نہیں لینے دیتے۔" فیض صاحب کو تو صوفی صاحب کے یہ الفاظ سن کر بے تحاشہ ہنسی آ گئی اور وہ قہقہے لگاتے بلکہ قہقہوں پر قابو پانے کی کوشش میں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرے ہو گئے مگر میں چند لمحے ضبط کیے کھڑا رہا۔ پھر فیض صاحب کو ہنسی سے بے چین دیکھ کر میں بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا اور ہنسنے لگا۔ صوفی صاحب پریشان ہو کر کبھی فیض صاحب کو دیکھتے تھے کبھی مجھے گھورتے تھے اور آخر فرمایا "یہ ہنسی کیسی بات ہے؟ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے کہ ہنسی کیے جا رہے

ہیں۔ اور ہاں فیض ایک محفل میں تمہاری تازہ غزل کے تین شعر تمہارے ایک عقیدت مند نے سنائے تو لطف آ گیا۔ میں نے یہ تینوں شعر نوٹ کر لیے۔ اب بھی میری جیب میں ہیں۔'' یہ کہہ کر ملک صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور فیض صاحب کو ان کے شعر سنانے لگے۔ انہوں نے تینوں کے تینوں شعر غلط پڑھے۔ پھر جب وہ کاغذ تہہ کر کے دوبارہ کوٹ کی جیب میں منتقل کر کے چپ گئے تو میں نے فیض صاحب سے عرض کیا ''اس دنیا میں آپ کا کیسا کیسا عقیدت مند موجود ہے فیض صاحب!'' وہ میرے طنز کو سمجھ گئے اور بولے ''ہمارے سیاست دان شعر کے معاملے میں عموماً جاہل ہوتے ہیں۔''

اب سونے کا وقت آیا تو فیض صاحب نے نیچے کی برتھ پسند کی اور میں نے اوپر کی۔ شدید گرمی کے موسم میں ڈبے کی یخ فضا باقی تینوں کے لیے تو معمول کا درجہ رکھتی تھی مگر میرے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ میں اوپر کی سیٹ پر ایک آسودگی کے احساس کے ساتھ لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سو بھی گیا مگر زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میں سردی سے کانپنے لگا۔ نیچے جھانکا تو فیض صاحب بیڈ لائٹ جلائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا ''فیض صاحب مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ اوڑھنے کے لیے کوئی موٹا کپڑا ہوگا آپ کے پاس؟'' فیض صاحب مسکراتے ہوئے اٹھے اور اپنی اٹیچی میں سے ایک بڑا سا تولیہ نکال کر مجھے دیا اور ساتھ ہی فرمایا ''وہ ضرب المثل تو آپ نے ضرور سنی ہوگی۔ وہی کہ ---- گھی ہضم نہیں ہوتا!'' اس پر ہم دونوں نے قہقہہ لگایا تو دونوں فلمی شخصیتوں نے جیسے ڈسٹرب ہو کر کروٹ بدلی۔

میں یہ بڑا سا تولیہ اوڑھ کر سو گیا مگر آدھ پون گھنٹے کے بعد آنکھ کھل گئی۔ شدید ٹھنڈک تولیے کو پار کر کے میری ہڈیوں تک میں اتری جا رہی تھی۔ جب میں نے نیچے والی سیٹ پر فیض صاحب کو دیکھا تو وہ اپنے گھٹنے سینے سے

بیئر کے سلسلے میں آپ کے متعلق کچھ اور بتایا تھا۔"

رفیق صاحب بولے "کیا بکواس کی تھی اس کشمیریے نے؟"

میں نے کہا "منٹو کہتے تھے کہ رفیق غزنوی کا سا مضبوط جثے کا آدمی بھی بیئر کی دو بوتلیں پی لیتا ہے تو اس سے ایک خاص لفظ ٹھیک سے نہیں بولا جاتا ---- اس کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ اسے نشہ ہو جاتا ہے۔"

رفیق صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "میں نے بتایا تھا نا کہ منٹو فضول بک بک بہت کرتا تھا۔ اس نے آپ کو کون سا لفظ بتایا تھا۔"

فیض صاحب نے مجھے مخاطب کیا "رفیق دو بوتل بیئر چڑھا لے تو پھر بتائیے گا۔"

فیض صاحب تو جیسے تاک میں تھے۔ جب رفیق صاحب نے دوسری بوتل کا آخری گھونٹ بھی پی لیا تو فیض صاحب بولے "اب بتایئے منٹو نے کس لفظ کی بات کی تھی۔"

رفیق صاحب نے بھی کہا "جی ہاں دو بوتلیں تو میں نے پی لیں۔ اب بتایئے وہ کون سا لفظ ہے جو میں ٹھیک سے نہیں بول سکوں گا۔"

میں نے کہا "ذرا بول کر دکھایئے "ٹمبکٹو بولیے۔"

رفیق صاحب بولے "ٹکٹمبو"!

فیض صاحب نے زور کا ایک قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا "ٹمبکٹو۔ ٹمبکٹو بولیے۔"

رفیق صاحب نے کہا۔ "بول تو رہا ہوں۔ ٹکٹمبو---- ٹکٹمبو----"

فیض صاحب کا ہنستے ہنستے بڑا حال ہو گیا مگر رفیق صاحب کہتے رہے۔ "ہنس کیوں رہے ہیں فیض صاحب؟ کہہ تو رہا ہوں۔ ٹکٹمبو---- ٹکٹمبو---- منٹو شرارت کرتا تھا۔"

سے سیمنٹ کے کھمبے میں دے ماری۔ ہنسنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ فیض صاحب نے گاڑی وہیں چھوڑی اور فیروز سنز میں آ کر اپنے دفتر فون کیا کہ ڈرائیور آئے اور ہماری گاڑی لے جائے۔

ہم لوگوں نے فیض صاحب کی ڈرائیونگ کے بارے میں یہ تک مشہور کر رکھا تھا کہ وہ کار کو روکنا جانتے ہی نہیں اس لیے انہوں نے پٹرول کا ایک خاص پیمانہ مقرر کر رکھا ہے چنانچہ اس پیمانے کے مطابق پٹرول پاکستان ٹائمز کے دفتر کے سامنے ختم ہو جاتا ہے اور گاڑی خود بخود رک جاتی ہے۔

اور یہ تو خیر واقعہ ہے کہ میں بھی فیض صاحب کی گاڑی میں موجود تھا۔ دو اور لوگ بھی تھے۔ اب یاد نہیں کہ کون کون تھے۔ بہرحال گاڑی پاکستان ٹائمز کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ فیض صاحب نے ایک مقام پر گاڑی کا گیئر بدلا۔ ٹھیک اسی وقت قریب سے گزرنے والے ایک ٹرک میں بھی گیئر بدلا گیا جس میں سے گھرر کی ایک خوفناک آواز آئی۔ فیض صاحب سمجھے یہ آواز ان کی گاڑی کے گیئر سے آ رہی ہے چنانچہ بریک لگائی اور بولے ''وبھئی قصہ تو ختم ہو گیا۔ گیئر ٹوٹ گیا ہے۔'' تب ہم نے عرض کی کہ یہ آواز ٹرک کے گیئر ن تھی' آپ کی کار کے گیئر کی نہیں تھی اور پھر سب مسافر جی کھول کر ہنسے۔

لائل پور کاٹن ملز دلی کلاتھ ملز کا ذیلی ادارہ تھا جہاں ہر سال پاکستان و ہند کے منتخب شعرا جمع ہوتے تھے اور دو مشاعرے منعقد ہوتے تھے---- ایک خاص مشاعرہ---- دوسرا عام مشاعرہ---- ان مشاعروں میں شعرا کو نقد معاوضے کے علاوہ کاٹن ملز کی بعض مصنوعات کا بنڈل بھی پیش کیا جاتا تھا اور جب شعرا صبح کو واپس جانے کے لیے سڑکوں پر نکلتے تھے تو انگلیاں اٹھتی تھیں اور تضحیک کے انداز میں کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ طے کیا گیا کہ مل کے منتظمین سے کہا جائے کہ وہ کپڑے کے بنڈل دینے کی بجائے ہر شاعر

مالک ہمیں مل کے اندر لے گئے۔ ریشمی کپڑا تیار ہو رہا تھا اور مشینوں میں سے یوں نکل رہا تھا جیسے آبشار گر رہا ہے۔ اس معائنے سے محظوظ ہونے کے بعد ہمیں اس سے ''مستفید'' ہونے کا انتظار رہا کہ مل مالک سلک کا ایک ایک تھان تو ضرور ہماری نذر کریں گے مگر انہوں نے صرف خدا حافظ کہنے پر اکتفا کیا۔ مجھ سے کہا کہ آپ ''امروز'' میں ''حرف و حکایت'' کا کالم لکھتے ہیں' اب کے ہم غریبوں کے بارے میں بھی کچھ لکھ ڈالیے گا۔

میں نے پوچھا ''آپ غریب کیسے ہو گئے محترم؟''

وہ بولے ''دیکھیے نا اسی لائل پور میں ایک کاٹن مل ایسی بھی ہے جس کا مالک ایک لاکھ روپیہ روزانہ منافع کماتا ہے۔ ہم اپنی اس مل سے صرف تیس پینتیس ہزار روزانہ کما پاتے ہیں' اس صورت میں ہم غریب نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔''

میں نے کہا ''اس صورت میں تو آپ صرف غریب ہی نہیں' کنگلے قلاش ہیں۔ میں واپس جا کر آپ کے ارشادات کی روشنی میں ایسا کالم لکھوں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔''

میں نے موعودہ کالم لکھا اور پھر مل مالک صاحب سے زندگی بھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں نے ملاقات کی گنجائش ہی ختم کر دی تھی۔

میرے ایک مضمون میں گورے ملکوں کے حکمرانوں کی بجائے گوروں کی مذمت کی گئی تھی۔ فیض صاحب نے نہایت دلداری سے مجھے ٹوکا کہ سب گورے برے نہیں ہوتے' ان کے حکمران برے ہیں' جیسے ہم لوگ خراب نہیں مگر ہمارے حکمران بہت خراب ہیں۔ میں نے آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔

ایک روز میں نے فیض صاحب سے کہا کہ لاہور کے ایک روزنامے میں ہر ہفتے ایک صاحب آپ کے خلاف قطعہ لکھتے ہیں۔ آپ کے اتنے بے شمار

مشرقی ایشیا کے سبزہ زاروں پر سکون سے اڑتا جا رہا تھا۔

طیارہ بنکاک میں اترا۔ وہاں ''کے۔ایل۔ایم'' والوں نے ہمیں ایک کار دی کہ ہانگ کانگ جانے میں ابھی بہت وقت ہے۔ شہر کی سیر کر آؤ۔ لیفٹی صاحب، مولانا اختر علی خان اور میں بنکاک کی مختلف سڑکوں پر گھوم پھر کر ایک ریستوران میں آئے اور کافی کا آرڈر دیا۔ مولانا اختر علی خان نے ایئرپورٹ پر ہی روپوں کے بدلے تھائی لینڈ کے رنگین نوٹ حاصل کر لیے تھے۔ انہوں نے کافی کا بل ادا کرتے ہوئے ایک نوٹ دیا۔ جب بیرا باقی رقم واپس لایا تو مولانا نے ''ٹپ'' کہہ کر بتایا واپس کر دیا۔ بیرا بار بار رکوع کی حالت میں جھک جھک گیا۔ ہم باہر گاڑی میں آ کر بیٹھے تو تب بھی یہ بیرا رکوع پر رکوع کر رہا تھا۔ مولانا نے کہا ''ادھر کے لوگ کتنے مودب ہوتے ہیں۔ پاکستان میں تو ٹپ دو تو بیرے یوں لیتے ہیں جیسے یہ ان کا پیدائشی حق تھا۔'' بعد میں ایئرپورٹ پر جا کر معلوم ہوا کہ مولانا نے ہوشربا رقم ٹپ میں دے ڈالی تھی۔ مثال کے طور پر اگر بل پانچ روپے کا تھا تو مولانا نے ایک سو کا نوٹ بیرے کو دے دیا تھا اور پچانوے روپے اسے ٹپ کر دیے تھے۔ تب مولانا نے فرمایا ''میں نے بھی کہا اس بیرے کو کیا ہو گیا ہے کہ اس کے رکوع ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہے ہیں۔''

طیارہ ہانگ کانگ کے ایئرپورٹ پر اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ نیچے عین مین وہی منظر تھا جو میرے دیہاتی دوست محمد سعید نے کھینچی تھی۔ وہ پولیس میں بھرتی ہو کر ہانگ کانگ گیا تھا اور جنگ چھڑنے پر جاپان کا قیدی ہو گیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ گاؤں آیا تو میں نے اس سے اس کے تجربات، مشاہدات کا پوچھا۔ اس نے ہانگ کانگ اور کولون کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہی نقشہ میرے سامنے تھا۔ میں محمد سعید کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا کہ اسی کی بتائی ہوئی تفصیلات سے کام لے کر میں نے اپنا افسانہ ''ماستا'' لکھا تھا جس کا پس منظر یہی ہانگ کانگ اور

ملحقہ سمندر میں چھوٹے جزائر ہیں۔

ہانگ کانگ ہوٹل میں ایک چینی ٹیلر آیا۔ سوٹ کے کپڑے کے کئی نمونے اس کے پاس تھے اور اس کا وعدہ تھا کہ آپ آرڈر دیجیے اور شام تک سلا سلایا سوٹ لے لیجیے۔ میں نے براؤن رنگ اور فیض صاحب نے سفید رنگ کا کپڑا پسند کیا اور شام کو ہی کپڑے کے سلے ہوئے اور بالکل فٹ سوٹ ہمیں مل گئے۔

دوسرے روز ہم سب مدیران جرائد ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتے کے لیے پہنچے ہوئے تو فیض صاحب وہی سفید سوٹ پہنے تشریف لائے۔ مگر وہاں ایک لطیفہ ہوا۔ ہوٹل کے بیروں نے بھی سفید سوٹ ہی پہن رکھے تھے۔ میں نے کہا "فیض صاحب جلدی سے سوٹ بدل آئیے ورنہ کوئی گاہک آپ کو بیرا سمجھ کر آرڈر دے ڈالے گا۔" فیض صاحب نے دیکھا کہ سب بیرے سفید سوٹ ہی میں ملبوس ہیں تو پریشان ہو گئے۔ پھر دس پندرہ منٹ کے بعد دوسرا سوٹ پہنے چلے آئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں لاہور میں اس سفید سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے یہ سوٹ سمندر میں پھینک دیا ہوگا۔

میں ہانگ کانگ ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی میں سے سمندر کا نظارہ کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک مسکراتا ہوا چینی اندر آیا اور کئی چینی لڑکیوں کا ایک البم میرے سامنے پھیلا دیا اور بولا "آپ جس تصویر پر ہاتھ رکھیں گے وہی لڑکی چند منٹ میں حاضر ہو جائے گی۔" میں تو کانپ گیا۔ مجھے کوئی راہ فرار نہ سوجھی تو میں نے کہا کہ پہلے اپنے لیڈر آف ڈیلیگیشن سے اجازت لینا ضروری ہے۔ وہ فلاں نمبر کمرے میں ہیں۔ پہلے ان کے پاس جاؤ۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ آدھ

منٹ بعد فیض صاحب کا فون آیا کہ کیا اس ایلیم بردار کو آپ نے ہماری طرف بھیجا تھا؟ میں نے کہا ''فیض صاحب میرا تو اپنے ملک سے نکلنے کا پہلا تجربہ ہے اور آپ نے تو پورا کرۂ ارض چھان رکھا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ ان بدمعاشوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ میں نے اسے آپ کے پاس بھیج دیا کہ آپ اسے مناسب الفاظ میں ڈانٹ دیں گے۔'' فیض صاحب بولے ''مطمئن رہیے۔ ہم نے ڈانٹ دیا ہے۔''

دوسرے روز شام کے قریب فیض صاحب میرے کمرے میں آئے اور بولے۔ ''چلیے ذرا ساحلِ سمندر تک گھوم آئیں۔'' میں نے کہا ''سبحان اللہ میرا بھی یہی جی چاہ رہا تھا۔'' ہم ایک دو سڑکیں طے کر کے ساحل پر پہنچے تو ساحل کی مضبوط ریلنگ پر یہاں سے وہاں تک سولہ سولہ سترہ سترہ سال کے لڑکے اونچی نیکریں پہنے ہوئے مختلف زاویوں سے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ اتنے بہت کم لباس لڑکے یہاں کیوں جمع ہیں جب ہانگ کانگ پولیس کا ایک سپاہی جو پنجاب سے تعلق رکھتا تھا' ہمارے پاس آیا اور اُردو میں پوچھا ''آپ وہی پاکستانی تو نہیں ہیں جو چین جا رہے ہیں اور کل ہی یہاں پہنچے ہیں؟'' ہم نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا ''آپ یہاں کیوں آ نکلے ہیں۔ یہ تو لونڈے طوائفوں کا مرکز ہے۔ یہاں سے نکل جایئے ورنہ ابھی کوئی فوٹوگرافر آ کر آپ کی تصویر اتار لے گا اور اخبار میں اس کیپشن کے ساتھ چھاپ دے گا---- ''پاکستانی ایڈیٹر ہانگ کانگ کے لونڈا بازار میں۔'' ہم یہ سن کر بھاگے تو نہیں مگر اس تیزی سے واپس آئے جیسے ہمارے پاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر ہم سانس لینے کے لیے رکے اور پھر خوب جی کھول کر ہنسے کہ اگر یہ پاکستانی نوجوان ہماری مدد کو نہ آتا تو ہمارا کیا بنتا!

آپ کے وزیراعظم نے اپنا دورہ منسوخ کر دیا ہے۔ اس کا ہمیں ہانگ کانگ ہی میں علم ہو گیا تھا مگر آپ سے ذکر نہیں کیا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ آپ کے وزیراعظم آتے تو آپ عوامی چین کی حکومت کے مہمان ہوتے۔ مگر اب آپ کل چائنا جرنلسٹس یونین کے مہمان ہیں اور ہم آپ کو پورے چین کا دورہ کرائیں گے۔'' ڈھیلی ڈھیلی تالیاں بجیں کیونکہ ہم سب اندر سے شرمندہ تھے کہ ہم جس خبر کو چھپائے ہوئے تھے' اس سے ہمارے میزبان بہت پہلے سے باخبر تھے!

چین کی جرنلسٹ یونین نے ہمیں چین کے جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک کا دورہ کرایا۔ جب بھی ہم لوگ کسی شہر میں پہنچتے' ہمارے استقبال کو وہاں کے جرنلسٹ موجود ہوتے۔ ہر شہر میں فیض صاحب ہم سب کا تعارف کراتے۔ دورے کے آخری دن تک میری باری آئی تو میرا نام بتانے کے بعد فیض صاحب یہ کہتے۔

(He is the editor of a vernacular dialy "Imroze" which means "today")

ایک دو بار جی چاہا' فیض صاحب سے کہوں کہ ٹھیک ہے۔ میں روزناموں کے ایڈیٹروں کے وفد کا رکن ہوں مگر شاعر اور افسانہ نگار بھی تو ہوں۔ میرا تعارف کراتے ہوئے ایڈیٹری کے ساتھ ہی میری شاعری' افسانہ نگاری کا بھی ذکر کر دیجئے گا تو کیا کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے گا' جبکہ آپ خاص طور پر مشرقی پاکستان کے ایڈیٹروں کی جرنلزم کے علاوہ ان کے مصوری موسیقی وغیرہ کے شوق کا بھی ذکر فرما دیتے ہیں۔ مگر میں ایسا کہہ نہ سکا کہ شاید مناسب نہ تھا۔

چین کے دورے کے آخری روز فیض صاحب نے پورے وفد کو اپنے کمرے میں جمع کیا اور انہیں بتایا کہ ''میری اطلاع کے مطابق آل چائنا جرنلسٹس یونین الوداعی پارٹی میں ہم سب کو بہت سے تحفے دے گی۔ ہم نے دور اندیشی

سے کام نہیں لیا اور پاکستان کا ایک بھی تحفہ ساتھ نہیں لائے۔ اب یہی ممکن ہے کہ آپ لوگوں کے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہے جو بطور تحفہ چینی دوستوں کو پیش کی جا سکے تو لائیے تاکہ دعوت میں ہماری شرمندگی ذرا سی تو کم ہو سکے۔''

وفد کے ہر رکن نے کوئی نہ کوئی چیز پیش کر دی۔ مشرقی پاکستان کے ایڈیٹر صاحبان ہم سے زیادہ باخبر نکلے کہ وہ اپنے ہمراہ بطور خاص تحائف لائے تھے۔ ان کے پاس بانس کی بنی ہوئی نازک نازک چیزیں خاصی تعداد میں تھیں۔ وہ جمع ہو گئیں۔ میرے پاس میرے پہلے مجموعۂ کلام ''جلال و جمال'' کا وہ نسخہ تھا جس کی طباعت مثالی تھی اور جس کا دیدہ زیب سرورق محترم عبدالرحمن چغتائی نے بنایا تھا۔ میں یہ کتاب پیکنگ یونیورسٹی میں اردو کلاس کو نذر کرنے لایا تھا۔ یونیورسٹی میں تو ہم لوگ گئے تھے مگر اردو کلاس کے انچارج ایک بھارتی صاحب تھے جن کا سلوک ہمارے وفد کے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ سو میں نے مصلحتاً کتاب انہیں پیش نہ کی اور وہ اب کام آ گئی۔ جب الوداعی دعوت میں یونین نے ہر رکن کو تحائف پیش کیے تو فیض صاحب نے بھی جوابی تحائف کا ''برگِ سبز'' یونین کے صدر کو پیش کیا۔ عجیب بات ہے کہ سب چینی میری کتاب پر جھپٹے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ کتاب میری ہے اور میں شاعر بھی ہوں تو سب نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور شکایت کرنے لگے کہ تم نے پورے ایک ماہ کے دوران ایک بار بھی یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم شاعر بھی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ بتانا تو وفد کے لیڈر کا فرض تھا۔ یہ سوال انہی سے جا کر پوچھیے۔

اس جگہ کا نام یاد نہیں آ رہا جہاں ایک سمندر نما جھیل دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ ہمیں [illegible] کشتی میں بٹھا کر جھیل کی سیر کرائی گئی جس کے وسط میں ایک جزیرہ [illegible] جزیرے پر ایک ریستوران تھا۔ یہاں ہمارا قافلہ رکا تو بیشتر لوگ [illegible] پر جا بیٹھے۔ میں نے اور [illegible] اور شاید ایک دو حضرات نے

بھی صرف اورنج جوس پر اکتفا کی۔ میرے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا اور میں جزیرے پر درختوں کی وہ قطار دیکھ رہا تھا جن کی دھاگے کی سی باریک اور جھیل کے پانی پر جھکی شاخیں ہوا کے ذرا سے جھونکے سے دور دور تک لہرا جاتی تھیں۔ یکایک فیض صاحب نے قہقہوں کے ساتھ اپنا بیئر کا گلاس میری اورنج جوس کے گلاس میں انڈیل دیا۔ میں نے اپنا یہ آلودہ جوس جھیل کے پانی میں گرا دیا تو فیض صاحب نے سخت شکایت کی کہ میں نے ایک نعمت کی ہتک کی ہے اور وہ آئندہ کبھی مجھے شراب پینے پر مجبور نہیں کریں گے۔ اور واقعی وہ اپنے اس عزم پر قائم رہے بلکہ بعض محفلوں میں، جہاں شراب اندھا دھند پی جا رہی تھی، فیض صاحب نے ان نشے میں دھت لوگوں کی دستبرد سے مجھے بچائے رکھا، جو نشے کے عالم میں بضد تھے کہ اگر یہ شاعر پیتا نہیں ہے تو آج اسے زبردستی پلا کر چھوڑیں گے۔

دیوارِ چین کی سیر کرنے کے بعد جب ہم لوگ دیوار ہی کے قریب ایک ریستوران میں چائے پی رہے تھے تو ہمارے میزبانوں نے اصرار کیا کہ ہم انہیں پاکستانی قومی ترانہ سنائیں۔ ضمناً مجھے یاد آیا کہ میں ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور میں نظربند تھا جب سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا کہ حکومت کی طرف سے میرے نام چھاگلہ صاحب کے اس آرکسٹرا کا ریکارڈ آیا ہے جس کے مطابق قومی ترانہ لکھا جائے گا۔ ایک بے گناہ محبوس شاعر سے قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش پر میں حیران رہ گیا تھا۔ میں نے صرف یہ دھمکی دینے پر اکتفا کی کہ میں یہاں جیل میں ایسا ترانہ لکھوں گا کہ حکومت یاد کرے گی اور بس!

بہرحال حفیظ صاحب کا لکھا ہوا ترانہ ہمارا قومی ترانہ قرار پایا تھا مگر یہ نیا نیا واقعہ تھا اس لیے یہ ترانہ ہم میں سے کسی کو یاد نہیں تھا۔ چینی دوستوں کی فرمائش پر ہم لوگ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جب مولانا اختر علی

متاثر ہوئے مگر فیض صاحب تو اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ ان کا رنگ سرخ ہوگیا۔ وہاں سے ہمیں ایک اور مقام کی سیر کو جانا تھا مگر فیض صاحب نے ہمارے ہمراہ جانے سے انکار کر دیا۔ وہ آج کی حسین و جمیل تواضع سے اس حد تک متاثر تھے کہ تنہائی میں شعر کہنا چاہتے تھے۔ سنکیانگ پر ان کی نظم شاید اسی تاثر کا اظہار ہے

ساقیا ! رقص کوئی ' رقصِ صبا کی صورت
مطربا ! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

ہمیں ارمچی کے شمال مغرب میں پھیلی ہوئی وسیع چراگاہیں دکھائی گئیں جہاں چرواہے گھوڑوں پر سوار سینکڑوں بھیڑوں کے گلوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہماری مدارات کے سلسلے میں وہاں ایک خوبصورت خیمہ نصب تھا۔ اندر غالیچوں اور گاؤ تکیوں کی فرشی نشستیں تھیں۔ دو نوجوان ترکستانی لڑکیاں ہماری دعوت کا سامان سامنے رکھے ہماری منتظر تھیں۔ وہاں کا رواج ہے کہ اپنے معزز مہمانوں کی دعوت کے موقعے پر قبیلے کی دو کنواری لڑکیاں مہمانوں کو کھانا نکال کر دیتی ہیں۔ ہمیں بھی ان لڑکیوں نے کھانا دیا۔ ساتھ ہی دودھ کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں بھی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ان پیالیوں میں گھوڑی کا دودھ ہے جو صرف معزز مہمانوں کی نذر کیا جاتا ہے۔ کسی نے بھی گھوڑی کا دودھ پینے کا حوصلہ نہ کیا۔ میں فیض صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ اگر یہ دودھ کسی نے بھی نہ پیا تو میزبان برا مان جائیں گے۔ فیض صاحب بولے ''تو پھر آپ ہی ہمت کیجئے۔ شراب نہیں پیتے تو دودھ ہی پی لیجئے۔'' میں نے وہ دودھ پی لیا اور پھر اتنے شدید فلو میں مبتلا ہوگیا اور مجھے اتنا تیز بخار ہوگیا کہ واپس پیکنگ پہنچنے پر دو تین روز تک ڈاکٹر مسلسل میرے علاج میں مصروف رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرے گھوڑی کا دودھ پینے کی خبر کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' میں چھپ گئی اور

اس کے بعد ''فتوے'' جاری ہوتے رہے کہ گھوڑی کا دودھ حلال ہے یا حرام ہے۔

فیض صاحب میری مزاج پرسی کو آئے تو بولے ''گھوڑی کا دودھ حرام ہی ہوگا مگر ہمیں یہ تشفی ہے کہ کوئی حرام چیز تو آپ کے معدے میں اتری۔''

ہندوستان واپس آ کر ہم سب اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دہلی پرکاش کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہندوستان سے اسرار الحق مجاز کے علاوہ حضرت فراق گورکھپوری بھی تشریف لائے تھے۔ مجاز صاحب دفتر 'امروز' میں مجھ سے ملنے آئے تو یہ نہایت دلچسپ واقعہ ہے جس کی تفصیل آئندہ کسی موقعے پر بیان کروں گا۔ البتہ فراق صاحب کی تشریف آوری تو میرے لیے ایک دلآویز واقعہ تھی۔

میں 'امروز' کے دفتر میں بیٹھا تھا جب فراق صاحب تشریف لائے۔ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے سب بٹن کھلے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ میں برسوں سے ان کا عقیدت مند تھا۔ میرے ہاں ان کی آمد میرے لیے عید تھی۔ میں نے خوشی سے کہا کیا آپ چائے پسند فرمائیں گے کیونکہ اخباروں کے دفتروں میں واحد مدارات چائے ہی سے ہوتی ہے۔ فراق صاحب بولے [illegible] ہم دونوں بیٹھے تھے کہ جب فیض تو جیل [illegible] سے بالمشافہ دو دو باتیں ہو جائیں۔

دراصل ان دنوں کسی مسئلے پر فراق صاحب اور علی سردار جعفری صاحب کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور دونوں اخباروں اور رسالوں میں ایک دوسرے کے خلاف [illegible] فیض صاحب نے ایک بیان [illegible] اور فراق صاحب اسی سلسلے میں فیض صاحب سے [illegible]

[illegible] دنوں یہ [illegible] کہ فراق صاحب [illegible]

تشریف فرما ہیں اور آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ فیض صاحب فوراً پہنچے۔ فراق صاحب سے معانقہ کیا۔ تب فراق صاحب نے کہا "ہاں تو فیض! تحریری اختلاف سے خواہ مخواہ گرد اڑتی ہے۔ بالمشافہ گفتگو ہو جائے تو اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ سو بتاؤ کہ علی سردار جعفری کے نظریاتی بچپنے کا تمہارے پاس کیا جواز ہے؟" فیض صاحب نے ہاتھ جوڑ دیے اور بولے "میں آپ کے ساتھ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا فراق صاحب! میں معذرت چاہتا ہوں۔"

فراق صاحب نے کہا "مگر اخباروں میں تو تم نے دبنگ بیان دے دیا تھا میرے نقطۂ نظر کے خلاف۔"

فیض صاحب بولے "میں معذرت خواہ ہوں فراق صاحب! بس کوتاہی ہوگئی۔ جانے دیجیے۔"

اب فراق صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "ہاں بھئی ندیم! اب منگاؤ چائے۔ فیض نے تو ہتھیار ڈال دیے ہیں۔"

جب فراق تشریف لے گئے تو میں نے فیض صاحب سے عرض کیا "ایک دم اتنی معذرت کی کیا ضرورت تھی فیض صاحب تھوڑا سا تبادلہ خیالات ہو جاتا تو کیا برا تھا۔"

فیض صاحب بولے "آپ نہیں جانتے ندیم صاحب! یہ شخص بلا ہے بلا۔ اس نے اردو، انگریزی، فارسی اور ہندی ادب کو گھوٹ کے پی رکھا ہے۔ شکست ہماری ہی ہوتی اس لیے ہم نے معذرت ہی میں عافیت سمجھی!"

لاہور میں پاکستان آرٹس کونسل اسلام آباد کے زیرِ انتظام ایک تقریب منعقد ہوئی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا مگر میں مصروفیت کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ ایک شام کو ابنِ انشاء صاحب میرے پاس آئے اور بولے "آج ابھی ابھی ایک اجلاس کے بعد فیض صاحب نے متعدد اہلِ قلم کو ایک کمرے میں جمع کر کے

انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور یہ نہ سوچا کہ اسی نام کی کولمبو مرکز والی کانفرنس سے اختلاف کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ مگر میں نے ایسا نہیں ہونے دیا اور اپنی مجلسِ عاملہ کے جن ارکان نے فیض صاحب کے رویے پر اعتراض کیا انہیں سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا۔ دراصل قاہرہ مرکز زیادہ سرگرم تھا۔ اس کا ایک خوبصورت رسالہ ''لوٹس'' بھی تھا۔ اس کے ایڈیٹر یوسف السباعی کے قتل کے بعد فیض صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ نہایت اہتمام سے چھپتا تھا۔ پورے افریقہ اور ایشیا بشمول پاکستان کے ادیبوں شاعروں کے انگریزی تراجم اس میں شائع ہوتے تھے۔ فیض صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے ''لوٹس'' کو میری شاعری یا افسانہ نگاری کا نوٹس لینے کی کبھی توفیق نہ ہوئی اور دیگر اہلِ قلم کے تراجم باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ فیض صاحب میرے حوالے سے کسی نہ کسی ڈھکے چھپے تعصب میں ضرور مبتلا ہیں ورنہ میں ایسا گم نام تو نہیں تھا کہ ان کے ''افرو ایشین لوٹس'' کے صفحات میں بار نہ پا سکتا!

جنرل ایوب کے دورِ آمریت میں سرکاری سطح پر پاکستانی کلچر کے تعین کے سلسلے میں فیض صاحب کی رہنمائی میں ملک کے اہلِ فن اور اہلِ دانش سے مکالمے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پشاور سے ڈھاکہ تک فیض صاحب اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ اسی سلسلے میں دورے کرتے رہے۔ لاہور میں ان کا قیام سب سے زیادہ طویل تھا مگر وہ میرے پاس تشریف نہ لا سکے اور نہ مجھے اپنے ہاں بلایا۔ شاید انہوں نے مجھے کلچر کے موضوع پر گفتگو کے قابل ہی نہ سمجھا جبکہ پاکستانی کلچر سے متعلق میرے متعدد مضامین ''امروز'' میں شائع ہوتے رہے تھے اور فیض صاحب ان سے بے خبر نہیں تھے۔ بہرحال وہ شعر و فن سے متعلق اپنے پسندیدہ لوگوں کے انٹرویو ریکارڈ کرتے رہے۔ ان کی اس نوع کی بے اعتنائیوں کے سلسلے میں اب میری حیرت ختم ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ شعوری

اے خدا! اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

میں غزل پڑھ کر واپس فیض صاحب کے پاس آ کر بیٹھا تو فیض صاحب بولے ''آپ تو زبان کے سلسلے میں خاصے محتاط ہیں مگر آخر کیا بات ہے کہ آپ تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرنے لگے ہیں۔'' میں نے پوچھا ''مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے فیض صاحب؟'' بولے ''آپ نے غزل کے آخری شعر میں کہا ہے----''اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے!'' آپ نے فردوس کو مذکر قرار دیا ہے جبکہ آپ پاکستانی فلموں کی جس مشہور ہیروئن فردوس پر اپنا حق جتا رہے ہیں وہ خاتون ہے' سو مونث ہے!''

ہم اس بات پر دیر تک ہنستے رہے۔ تب میں ہنستے ہوئے صرف اتنا کہہ سکا ''فیض صاحب! آپ نے تو گلشن والے لطیفے کا فوراً ہی انتقام لے ڈالا ہے۔''

فیض صاحب ایک دو دن کے لیے لاہور آئے تو عزیزی ظہیر بابر اور بہن خدیجہ مستور نے انہیں اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ دوسرا مہمان صرف میں تھا۔ ہم چاروں نے مزے لے لے کر اور شگفتہ باتیں کر کے خوب لطف اٹھایا۔ خدیجہ بلا کی فقرے باز تھیں۔ وہ فقرے پر فقرہ مار رہی تھیں اور ہم ہنس رہے تھے۔ کھانے کے بعد پھل لائے گئے۔ نہایت خوبصورت انگوروں کے طشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے فیض صاحب سے کہا ''فیض صاحب! یہ انگور بہت عمدہ ہیں۔ ضرور چکھیے۔' وہ بولے ''ہمیں انگور اس کچی صورت میں پسند نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''معاف کیجئے' مجھے معلوم تھا کہ آپ کو تو انگوروں کی صرف متعفن صورت پسند ہے۔'' اس پر سب کھل کے ہنسے۔

فیض صاحب نے قیامِ کراچی کے دوران ایک ادبی انجمن بھی قائم کی

کہ ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ کل مجھے ایک ادبی محفل کی صدارت کرنی ہے جس میں حیدرآباد کے تین چار نوجوان افسانہ نگار اپنے افسانے پڑھیں گے اور محترم ڈاکٹر احسن فاروقی بضد ہیں کہ میں اس میں ضرور شرکت کروں۔ میرے پاس ایک یہی سوٹ ہے جو میں نے پہن رکھا ہے۔ آپ کے ساتھ جاؤں تو سونے کے کپڑے کہاں سے لوں گا اور اس سوٹ کو کل کے لیے کیسے بچاؤں گا۔ رسول بخش صاحب بولے ''معلوم ہوتا ہے آپ اپنے اٹھوائے جانے پر بضد ہیں۔'' عرض کیا ''ویسے تو اس سلسلے میں آپ کی بڑی شہرت ہے مگر----'' مگر فیض صاحب نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کر کہا ''نہیں آپ چلیں گے ہمارے ساتھ۔''

قہر درویش برجانِ درویش میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں رسول بخش صاحب کی جیپ ایک بہت بلند دروازے کے سامنے رکی۔ ہم تینوں ایک ہال میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی دو درجن وڈیرے حضرات وسکی پی رہے تھے اور ہال میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ فیض صاحب کو سب پہچانتے تھے۔ ''فیض آ گئے۔ فیض آ گئے۔'' کا شور اٹھا اور وسکی کی ایک بوتل کے ہمراہ تین گلاس فوراً ہمارے سامنے سج گئے۔ بلانے والے صاحب سے فیض صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ نہیں پیتے۔'' وہ صاحب بولے۔ ''نہیں پیتے تو آج پییں گے۔ کیسے نہیں پییں گے۔ ہم انہیں گرا کر پوری بوتل ان کے منہ میں خالی کر دیں گے''---- نوجوان کے تیور دیکھ کر فیض صاحب ور رسول بخش صاحب دونوں نے وہاں سے کسی بہانے اٹھ جانے کا فیصلہ کیا ور وہ وہاں سے نکل بھی آئے اور مجھے اس سلوک سے بچا لیا جو شاید میرے ساتھ واقع ہونے والا تھا۔

ہم تالپوریوں کے بنگلے پر پہنچے۔ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی لطیف ہوا آ

بھی تو کھانا ہے۔"

فیض صاحب بولے۔ "ہم نہیں کھائیں گے۔"

رسول بخش صاحب نے کہا "مگر ندیم صاحب کا کیا ہوگا۔ ندیم صاحب' آپ میرے ساتھ آیئے۔ کچن میں جا کر دیکھتے ہیں کچھ نہ کچھ تو رکھا ہوگا'

فیض صاحب مسلسل وہسکی پینے میں مصروف تھے۔ ہم دونوں بنگلے کے اندر داخل ہوئے۔ ایک طرف سے ڈھولک اور نسوانی آوازوں میں سندھی گانے سنائی دیے۔ پردے کے پیچھے سے رسول بخش صاحب نے مجھے یہ منظر دکھایا جس میں بہت سی عورتیں سندھ کا بوقلموں لباس پہنے دائرے میں ناچ رہی تھیں۔ کوئی تقریب ہوگی۔ میں نے تفصیل نہ پوچھی کیونکہ میں تو بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ وسیع و عریض کچن میں رسول بخش صاحب یہاں سے وہاں تک دیگچوں اور دوسرے برتنوں میں جھانکتے رہے آخر انہیں پکوڑوں کی شکل کی کوئی چیز ملی۔ وہ اٹھا لائے مگر وہ چیزیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور کھانے کے لائق نہیں تھیں۔ میں نے کہا "رسول بخش صاحب چلیے' کھانے پر مٹی ڈالیے۔ اب باہر چلیں اور ذرا سا سوئیں' کیونکہ رات کے دو بج رہے ہیں۔ آپ یوں کریں کہ میرا یہ سوٹ بچانے کے لیے کوئی شلوار وغیرہ لا دیں۔"

میں باہر فیض صاحب کے پاس آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد رسول بخش صاحب ایک بڑی سی سندھی شلوار لے آئے اور میرے حوالے کر دی۔ میں نے یونہی تجربتاً اسے کھولا تو وہ کھلتی چلی گئی۔ ایک پانچے میں ٹانگ ڈالی تو وہاں آٹھ دس ٹانگوں کی گنجائش تھی۔ میں نے کہا "فیض صاحب آپ اور میں اس شلوار کے ایک ہی پانچے میں سما جائیں گے۔ تشریف لایئے کہ شلوار کا یہ ایک پانچہ اوڑھ کر تھوڑا سا سو لیں۔"

فیض صاحب ہنستے رہے اور رسول بخش صاحب کہتے رہے "کیا کیا

جائے۔ ہم سندھیوں کی شلوار تو ایسی ہی مردانہ ہوتی ہے۔"

میں نے سونے سے پہلے ہی سو جانے کا فیصلہ کیا اور رسول بخش صاحب نے سونے سے پہلے جانے کی اجازت مانگی۔ البتہ ہمیں خبردار کیا کہ کتے کھول دیے جاتے ہیں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو پلنگ پر سے ہی طلب کر لیجئے گا۔ خدمتگار آپ کے پاس موجود ہوں گے۔ اور فیض صاحب صبح ٹھیک پانچ بجے جاگ جاتے ہیں۔ آپ کو واپس کراچی جانا ہے اور ندیم صاحب آپ کو اپنے ساتھ ملتان سے پنڈی جانا ہے۔ سو شب بخیر۔"

وہ تو چلے گئے۔ فیض صاحب نے وہسکی پینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر میں نے عرض کیا "فیض صاحب! اب بس بھی کیجئے۔ آخر پینے کی کوئی تو حد بھی ہوتی ہوگی۔"

ایک آدھ پیگ پینے کے بعد فیض صاحب پلنگ پر آگئے اور بولے "چلئے آپ کہتے ہیں تو ہم ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔"

پھر وہ دیر تک عالم میں شعر و شاعری اور مصوری و موسیقی کے بارے میں خوبصورت باتیں کرتے رہے۔ ایک بار رک کر مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں سوتا بن گیا۔ شاید وہ بھی مجھے خاموش پا کر ذرا سا سوئے ہیں۔ میں نہیں بولا تو وہ چپکے سے اٹھے اور میز پر سے ایک بوتل اٹھا کر ایک پیگ تیار کیا اور پینے لگے۔

میں نے کہا "فیض صاحب"

چونک کر بولے "ارے---- تو آپ جاگ رہے ہیں"

میں نے عرض کیا

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

فرمایا "اچھا آپ کہتے ہیں تو ختم۔" آخری پیگ پیا اور آ کر پلنگ پر

لیٹ گئے مگر چار بج چکے تھے۔ نیند کیسے آتی۔ ساڑھے چار بجے ڈرائیور نے چلنے کو کہا۔ ہم دونوں کار میں جا بیٹھے اور میں حیران ہوتا رہا کہ فیض صاحب کا ہاضمہ کس بلا کا ہے کہ رات گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک مسلسل پیتے رہے ہیں مگر نہ زبان لڑکھڑائی نہ چلنے میں توازن بگڑا۔ میں نے کار میں اس بات پر انہیں داد بھی دی تو وہ بولے ''شکریہ۔ مگر ہم نے زیادہ تو نہیں پی!''

جو شخص مسلسل پانچ گھنٹے شراب پیتا رہا ہو وہ اگر یہ کہے کہ میں نے زیادہ تو نہیں پی تو وہ یقیناً نشے میں ہے۔ میں نے اس روز پہلی بار فیض صاحب کو ''نشے'' میں دیکھا!

فیض صاحب کو سوویٹ روس کی حکومت نے ''لینن امن انعام'' دیا۔ اس کے ذکر سے پہلے ایک حالیہ واقعہ یاد آ رہا ہے کہ انگریزی روزنامہ ''فیشن'' لاہور کی ۲۷ جولائی ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں فیض صاحب پر پروفیسر جیلانی کامران کا ایک کالم شائع ہوا جس میں جدید عالمی حقائق پر فیض صاحب کی گہری نظر کے حوالے سے انہوں نے لکھا کہ میں نے ایک ملاقات میں یہ سوچ کر فیض صاحب سے ایک تیز دھار سوال پوچھا کہ وہ ترقی پسندانہ انداز میں گھڑا گھڑایا جواب دیں گے۔ سوال یہ تھا کہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کے بعد آپ کی نظر میں جدید ترین تاریخ کا اہم واقعہ کیا ہے؟ فیض صاحب نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ۱۷۸۹ء کے بعد انقلاب ایران عظیم ترین واقعہ ہے! یہ جواب سن کر پروفیسر جیلانی کامران اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے فیض صاحب کو اسلامی تاریخ کے عظیم دانش وروں میں شامل کر دیا اور یہ تک کہہ دیا کہ مسلم دانشور کی حیثیت سے فیض صاحب کا کوئی مثیل ہی نہیں---- اور فیض صاحب کے ہم خیالوں اور عقیدت مندوں نے سوچا کہ فیض صاحب کو انقلاب فرانس کے بعد دو صدیوں تک یعنی آج تک کوئی دوسرا عظیم واقعہ یا عظیم انقلاب کیوں یاد نہ

گویا یہ انقلاب روس اور انقلاب چین تو بیسویں صدی کے عظیم ترین انقلاب ہیں۔ کیا فیض صاحب ان انقلابات کو کسی اندرونی خوف کی وجہ سے گول کر گئے؟ [illegible] اور لیبیا میں بھی تو ایران کی طرح بادشاہتیں ختم کی گئیں اور ویت نام کے انقلاب نے تو امریکہ کی سپر طاقت کو مکمل اور ہمہ جہتی شکست کا مزہ چکھا دیا تھا۔ ایران کا انقلاب یقیناً اہم ہے مگر وہ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوسرے انقلابات کی صف میں شامل ہے۔ فیض صاحب نے اسے نہ جانے کس سبب سے انقلاب فرانس کے بعد عظیم ترین انقلاب قرار دے ڈالا تھا۔ اس کا یقیناً کوئی باطنی سبب ہوگا۔ اور چونکہ پروفیسر جیلانی کامران بھی اگر فیض صاحب کا یہ جواب سن کر جھوم گئے تو ہمارے جدید ادب کی اس بڑی علمی شخصیت کا یوں جھوم جانا بھی ایک حیرت آمیز استفہامیہ تخلیق کرتا ہے!

فیض صاحب جب ماسکو میں لینن امن پرائز لینے کے بعد لندن سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے تو انہوں نے بالکل ویسا ہی اوورکوٹ پہن رکھا تھا جیسا لاہور میں ہم چند ترقی پسند مصنفین نے لنڈے بازار سے خریدا تھا۔ ایک محفل میں جب فیض صاحب اوور کوٹ پہنے تشریف لائے تو میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے ان کے کوٹ کی آستین کو تھپتھپا کر پوچھا "یہ دانہ کتنے میں آیا ہے فیض صاحب؟"

"دانہ؟" فیض صاحب حیران رہ گئے۔

میں نے کہا "لنڈے بازار والے سب سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کو "دانہ" ہی کہتے ہیں۔"

فیض صاحب بولے "لنڈا بازار والے کہتے ہوں گے۔ ہم نے تو یہ دانہ لندن سے خریدا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی پوچھے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ کوٹ لندن سے

آیا ہے جبکہ لنڈن کی بجائے لنڈے بازار سے آیا ہوتا ہے۔"

فیض صاحب "لاحول ولا" کہہ کر رہ گئے اور ہم دو تین مصنفین' جنہوں نے لنڈے کے ایسے ہی کوٹ پہن رکھے تھے' دل کھول کر ہنسے۔

کراچی سے صہبا لکھنوی نے اپنے رسالے "افکار" کا ندیم نمبر نکالا تو میرے بارے میں علم وادب کی بڑی بڑی شخصیات کی آرا بھی شائع کیں۔ جوش ملیح آبادی صاحب کا ارشاد تھا "اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں' احمد ندیم قاسمی کو ان سب سے بمراحل بہتر سمجھتا ہوں۔" حفیظ جالندھری صاحب نے کہا "مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے بھی احمد ندیم قاسمی کا مماثل کہہ سکوں۔" اور فیض صاحب نے صرف یہ کہنا مناسب سمجھا "ادب' صحافت' ورشاعری میں ان کا مقام مسلّم ہے۔"---- یعنی پہلے ادب' پھر صحافت اور اس کے بعد میری بے چاری شاعری! یہیں سے مجھے شک گزرتا ہے کہ فیض صاحب نے میری شاعری کے حوالے سے اپنے اندر کوئی نامعلوم تعصب پال رکھا تھا۔

بھٹو مرحوم کے دور حکومت میں وہ اس حکومت کے مشیر مقرر ہوئے اور گلبرگ میں ان کا دفتر قائم ہوا۔ بہرحال دس بجے قبل دوپہر کا وقت تھا جب میں اس دفتر میں امجد اسلام امجد کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تب بھی وہ پی رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ "امجد بہت اچھا شاعر ہے اور اس کا مستقبل ماشاء اللہ تابناک ہے اس لیے اگر آپ اس کے مجموعۂ کلام کا مختصر سا فلیپ لکھ دیں تو میں ذاتی طور پر ممنون ہوں گا۔ مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ بھٹو کی المناک موت پر انہوں نے ایک بھی شعر نہ لکھا جبکہ مختلف احباب پر ان کی نوحہ نما غزلیں سب کے سامنے ہیں۔

فیض صاحب وسکی کا ایک گھونٹ لے کر مسکرائے اور بولے "ہم نے

سراسر غلط قرار دیا کہ آخر عارف صاحب مارشل لاء کے ایک اہم کردار تھے۔ میں خاموش رہا مگر یہ عرض کرنے کو بہت جی چاہا کہ عارف صاحب تو بہرحال شاعر ہیں مگر آپ نے کس خوشی میں اپنی تاریخ کے گھناؤنے کردار ---- انگریز ---- کی فوجی ملازمت غلامی ہی کے دنوں میں قبول فرمالی تھی! عجیب بات ہے کہ چند ہی روز بعد اخباروں میں خبر چھپی کہ فیض احمد فیض صاحب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کا وقت مانگا اور وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک جنرل صاحب سے گفتگو فرماتے رہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ گفتگو صرف موسمی حالات کے بارے میں تو نہیں ہوئی ہوگی!

پھر اسلام آباد ہی میں انہوں نے پولیس کے ایک ریٹائرڈ آئی جی کے کالموں کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت بھی فرمائی اور میں حیران ہوتا رہا کہ کے۔ایم۔عارف صاحب کی تقریب کی صدارت کے سلسلے میں وہ مجھ پر تو معترض تھے مگر آمرِ مطلق جنرل ضیاء الحق سے اپنی ہی درخواست پر ان کی ملاقات اور پولیس کے ایک کچھ زیادہ ہی اعلیٰ افسر کی کتاب کی افتتاحی تقریب کی صدارت کو کس کھاتے میں ڈالا جائے! سوچا ان سے اس تضاد کا پس منظر پوچھوں گا ضرور مگر وہ اس کے فوراً بعد علیل ہوگئے اور ۲۰ نومبر کو ان کا انتقال ہوگیا ---- ۲۰ نومبر جو میری تاریخِ پیدائش ہے' ان کی تاریخِ وفات قرار پائی۔ فیض کے جنازے میں شرکت اور ان کی تدفین اور ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں فورٹریس سٹیڈیم کے ایک ریسٹورینٹ میں آیا جہاں میں نے اپنی سالگرہ کے سلسلے میں چند عزیزوں اور دوستوں کو کئی دن پہلے سے بلا رکھا تھا مگر یہ حادثہ ہوگیا۔ چنانچہ میں نے انہیں ایک پیالی چائے پلانے پر اکتفا کی۔

لاہور میں فیض صاحب کے دو ریفرنس منعقد ہوئے۔ میں نے دونوں میں فیض صاحب پر تحسینی مضامین پڑھے اور پھر جب فیض صاحب کی یاد میں

وہاں اسی تقریب میں ایک بڑا پاک، ہند مشاعرہ منعقد ہوا تو میری باری آنے پر مجھے مجمع میں بیٹھے ایک گروپ نے "ہوٹ" کر دیا کہ میں ضیاء الحق کا ہوا خواہ تھا ۱۹۹۲ میں اس ضیاء الحق کا ہوا خواہ جس کے منعقدہ ریفرنڈم کو میں نے اس کے زمانہ اقتدار میں بھی "جنگ" کے ایک انٹرویو میں تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ قرار دیا تھا اور جس سے ملاقات کی میں نے کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

مجھے فیض صاحب کبھی نہیں بھولیں گے اور فیض صاحب سے بے لوث عقیدت مندی کا یہ "اعزاز" بھی مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔

فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے اس مرحلے پر میں مختصراً یہ عرض کروں گا کہ جب صابر دت نے بمبئی سے اپنے رسالے "فن اور شخصیت" کا فیض نمبر شائع کیا تو مجھے بھی پیغام بھجوانے کو کہا۔ میں نے جہاں فیض کی میٹھی رسیلی شاعری کا ذکر کیا وہاں یہ بھی کہا کہ فیض فکر و حکمت کی گہرائیوں میں جانے سے شعوری طور پر گریز کرتے تھے ورنہ جس طرح انہوں نے اپنی شاعری میں انقلاب کے موضوع کو مترنم بنا دیا اسی طرح وہ فکری شاعری کو بھی فنی جمالیات کا ایک شعبہ بنا سکتے تھے۔ ان کے ہاں اگر فکری گہرائی نہیں ہے تو نقاد حضرات ہی اس کے اسباب پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ایک نہایت پڑھے لکھے اور اردو پنجابی کے علاوہ انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں پر حاوی شخصیت نے فکری شاعری کو عملاً کیوں روکے رکھا، جبکہ غالب اور پھر اقبال اور دور حاضر میں راشد کی شاعری نے فکر کو شعر میں ڈھالنے کا کام آسان بنا دیا تھا۔

❋❋❋

# سیّد ضمیر جعفری

ہم دونوں ---- ضمیر اور میں ---- اختر شیرانی کے غیر مشروط عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ اختر عموماً عالمِ سرخوشی میں رہتے تھے مگر انہیں ہم دونوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔ چنانچہ وہ ہمارے ساتھ بے پناہ شفقت اور اپنائیت سے پیش آتے تھے۔ ضمیر اُن دنوں اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ وہ میری طرح اختر کے یہاں باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔

مجھے اس زمانے کی ایک رات یاد ہے جب اختر شیرانی نے بے پناہ پی رکھی تھی۔ گیارہ بجے رات کا عمل ہوگا جب ہم دونوں اختر کو تھامے فلیمنگ روڈ پر ان کے گھر لائے۔ اپنے کمرے میں، جو رسالہ ''رومان'' کا دفتر بھی تھا، اختر نے مجھ سے فرمائش کی کہ ان کی کوئی نظم ترنّم سے سناؤں ---- ''ترنّم سے؟'' ---- میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو روکا اور عرض کیا کہ میں تو ترنّم کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں۔ میرا گلا تو اتنا خراب ہے کہ تنہائی میں بھی گنگناؤں تو اپنے آپ سے شرما جاتا ہوں۔ تب اختر شیرانی ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے ''ندیم کو معاف کیا مگر ضمیر کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ گاؤ ضمیر ہماری نظم گاؤ۔ اے عشق کہیں لے چل ---- کس حال میں ہیں یارانِ وطن ---- جہاں ریحانہ

رہتی تھی ---- دیر حضرت سلمیٰ کی سمت جاتا ہوں ---- چلو سناؤ'' اور ضمیر گانے لگے۔

یہ ترنم اس ترنم سے بہت مختلف تھا جس میں وہ بعد میں پڑھتے رہے تھے سناتے رہے اور میں سوچتا رہتا تھا کہ ان کے کلام کے مزاج پر ان کے ترنم کا حرارت سونے پر سہاگے کا کام کر رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ضمیر ان دنوں نوجوان تھے۔ گلے میں توانائی اور صفائی تھی اور وہ اختر شیرانی کی نظموں کی فضا سے بھی مسحور تھے' چنانچہ انہوں نے جب اختر شیرانی کی ایک نظم ایسے دلآویز ترنم میں پڑھی تو اختر شیرانی متاثر ہو کر رونے لگے اور میں طلسم زدہ ہو کر رہ گیا۔

ان دنوں ضمیر کے سر پر طرے دار پگڑی ہوتی تھی۔ میں بھی طرے دار پگڑی باندھتا تھا۔ ہم اپنے ضلعوں کے لحاظ سے پڑوسی بھی تھے۔ وہ جہلمی میں گجراتی۔ ہمارا پنجابی کا لہجہ بھی ملتا جلتا تھا اور ہم دونوں جب اختر کے ہاں حاضر ہوتے تھے تو اختر کہتے تھے'' وہ آ گئے میرے طرے دار دوست''

یہ آج سے کم و بیش نصف صدی پہلے کا ذکر ہے اور کسی شخص کو پرکھنے کے لیے یہ مدت بہت کافی ہے۔ ضمیر اور میں اپنی مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے لحاظ سے خاصے دور رہے مگر ہمارے قلب و ذہن کا قرب' جو کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے' ہم دونوں کا عزیز ترین سرمایہ رہا۔ ایسے کھرے سونے کے سے تابندہ اور درخشندہ انسان میرے تجربے میں سے بہت کم گزرے ہیں۔ ننھی ننھی کمزوریاں سبھی میں ہوتی ہیں۔ یہ کمزوریاں ہماری انسانیت کی پہچان ہیں۔ مجھے تو ضمیر کے سے پیارے انسانوں کی کمزوریوں پر بھی پیار آتا ہے۔ مگر ضمیر کا مزاج اور کردار اتنی بہت سی خوبیوں سے لدا پھندا اور بھرا پڑا تھا کہ میں انہیں محبتوں کا کروڑ پتی کہتا تھا۔

محبت اور اپنائیت جیسے ان کی گھٹی میں پڑی ہوں۔ مجھے اس شخص پر رحم

آتا ہے جسے ضمیر سے تعارف کے بعد ضمیر کی اپنائیت نہ ملی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود اس کے اندر اس جذبے کا فقدان تھا جس سے ضمیر کا وجود چھلکتا رہتا تھا۔ وہ دو ایک بار متعارف ہونے والوں سے بھی اس قدر، قربت کے جذبے سے بات کرتے تھے کہ مخاطب یوں محسوس کرتا تھا جیسے اسے اپنا کوئی کھویا ہوا بھائی مل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی دنیا میں جو بے شمار حلقے اور گروہ بلکہ فرقے بنے ہوئے ہیں' ان سب میں ضمیر مقبول تھے کہ وہ کسی کا دل نہیں دُکھاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی ملازمت کے دوران بھی وہ اس طرح غیر مشروط طور پر ہر دلعزیز رہے ہوں گے۔

ضمیر غضب کے محفل آرا تھے۔ چند لمحوں ہی میں محفل کا محور بن جاتے تھے۔ ان کی باتوں میں اتنی شگفتگی ہوتی تھی کہ ان کی محفل سے مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے' سبھی محظوظ ہوتے تھے۔ وہ لطیفے بازی نہیں کرتے تھے' باتوں باتوں میں لطیفے تخلیق کرتے جاتے تھے۔ اوچھے وار کا بھی وہ اس سلیقے سے جواب دیتے تھے کہ وار کرنے والا بھی ''مشرف بہ ضمیر'' ہو جاتا تھا۔ شاعروں کی ایک پُر ہجوم محفل میں ضمیر شمع محفل بنے بیٹھے تھے جب حضرت حفیظ جالندھری بولے ''ضمیر! یہ تُو نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام ''مافی الضمیر'' کیوں رکھا ہے۔ اس مجموعے کا مناسب نام تو ''بے ضمیر'' تھا۔'' ضمیر فوراً بولے ''قبلہ یہ عنوان بھی میرے ذہن میں آیا تو تھا مگر پھر میں نے سنا کہ آپ اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھ رہے ہیں چنانچہ میں نے یہ عنوان اس کے لیے رہنے دیا۔''

اسی طرح ایک مشاعرے میں ضمیر سے ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں لاہور میں حضرت حفیظ بیمار تھے۔ ضمیر نے ان کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ ابھی دو تین روز پہلے میں نے انہیں دیکھا تھا۔ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر ضمیر نے پوچھا ''کہیں وہ اپنی شاعری سے بھی زیادہ کمزور تو نہیں ہو گئے؟''

مدتوں کی جدائی کے بعد جب برسوں پہلے ہم واہ میں کرنل شیر محمد خان مرحوم کے گھر میں جمع ہوئے تھے اور ہمارے ملک کے ایک ہیرو جنرل عبدالعلی ملک اور دیگر متعدد زعما کی موجودگی میں شعر و شاعری کی ایک محفل آراستہ ہوئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ ۸۰ سال نے ضمیر کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ جوانی کی طرح زندگی کے جوش و جذبے سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ وہاں کے دو تین روز کے قیام میں ہم نے اپنی پرانی وابستگیوں کو تازہ کیا تھا اور یہ تازگی و تازہ دلی آخر تک قائم رہی۔

میری بیٹی ناہید قاسمی نے نظمیں لکھنا شروع کیں تو "فنون" میں ان کی اشاعت پر انہوں نے اس بچی کو اتنی بہت سی داد بھجوائی کہ اس کی ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ خود میرا سینہ بھی کچھ اور فراخ ہو گیا۔ یہ ہمت افزائی ان کی فطرت میں تھی۔

بعد میں جب بیٹی منصورہ احمد کا مجموعہ کلام شائع ہوا تو ۳۰ جون ۱۹۹۶ء کو ضمیر صاحب نے منصورہ کے نام جو خط لکھا وہ ہمت افزائی اور قدر دانی کا شاہکار ہے۔ خط کی عبارت یہ تھی:

> "طلوع" کا نسخہ بھیجنے کے لیے شکر گزار ہوں۔ کتاب کا چہرہ ہی روشن نہیں اس کی روح بھی بڑی روشن ہے۔ یہ زندگی کو آگے لے جانے والی شاعری ہے۔ "طلوع" کی شاعری کو میں اردو شاعری کے افق میں ایک نئی صبح کا طلوع سمجھتا ہوں۔ تمہارے سبب میں انسان اور پرندے بہت قریب آ گئے ہیں۔ غزل میں بھی تمہاری بات کہنے کی ادا موہ لینے والی ہے مگر نظم میں تو فکر و خیال کا ایک جہان آباد نظر آتا ہے۔ ہمارا ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے یا نہیں مگر تم نے اردو نظم کو یقیناً اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا ہے۔"

خود میرے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بھی ضمیر صاحب نے محبت سے چھلکتے ہوئے مبالغے سے کام لیا اور فرمایا:

"ندیم صاحب کو تو اس سے کہیں زیادہ بڑے بڑے ---- جلیل و جمیل اعزازات ---- مل سکتے ہیں کہ کوئی ادبی اعزاز ان کی قامت کے برابر نہیں ہے۔ مگر میرے لیے تو اس تقریب کی صدارت، فضیلت مآب ---- کی پاکستان کی صدارت سے کم نہیں۔ چنانچہ اس "تمغۂ ندیم" کے بعد مجھے ادب کے کسی "تمغۂ یتیم" کی ضرورت نہیں۔"

اپنے اسی خطبۂ صدارت میں ضمیر صاحب نے متعدد مقامات پر میری محبت بھری تحسین کی۔ ذیل کی چند سطور محض اس لیے درج کی جا رہی ہیں کہ یہ ضمیر مرحوم کے اعلیٰ معیارِ تنقید کی ایک بھرپور مثال ہے:

"اس کی شاعری زندگی کا دریا ہے جس میں مختلف دھارے، مختلف سطحوں پر، ایک دوسرے کو چھوتے، اوپر اٹھتے، آگے نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی شاعری میں فکر کی ہمت بھی ہے، اسلوب کی رعنائی بھی اور محنت کی حدت و حرکت بھی، اور اُفق کی وہ بے کناری بھی جو تشنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آسمان پر ستاروں کا ایک عظیم جھرمٹ دکھائی دیتا ہے مگر ان میں بہت کم ستارے ہیں جو محض حادثاتی طور پر دریافت ہو گئے ہوں۔ ندیم اگلی صبح کا شاعر اور مستقبل کا صورت گر ہے ---- میرے نزدیک وہ ---- اقبال کے بعد ---- ان چند قدمین میں شامل ہے جن کی شاعری میں تاریخ کیا، انسانی تقدیر کے خلاف ایک بڑی طاقتور بغاوت کا شعلہ جلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

ان کا ضمیر محبت اور خلوص اور نیک نیتی سے اٹھا تھا۔ دوست یار ان کی شخصیت کو چائے سے تشبیہ دیتے تھے جو ہر موسم میں راحت بخش ہے کہ سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ضمیر کا شمار ان

اس نے کی پہلے پہل پیائش صحرائے نجد
قیس ہے در اصل اک مشہور پٹواری کا نام

پھر ''ولایتی زعفران'' کے نام سے ان کی وہ نظمیں شائع ہوئیں جنہیں وہ انگریزی کی مزاحیہ نظموں کے تراجم کہتے تھے لیکن اگر یہ تراجم ہیں تو ایسے تخلیقی تراجم سے اردو زبان ابھی تک محروم تھی۔

سنجیدہ شاعری میں بھی ضمیر اپنے دور کے کسی بھی بڑے شاعر سے پیچھے نہیں تھے۔ انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں سرزمین پاکستان کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ اپنی نظموں میں اپنے آس پاس کی جزئیات کو سمونے کا جو انداز نظیر اکبر آبادی نے اختیار کیا تھا' اس کی دوسری اہم مثال ضمیر جعفری کی یہ نظمیں ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں آگرہ اور اس کے نواح بولتے تھے۔ ضمیر کی نظموں میں پورے پنجاب کی آڑ میں پورا پاکستان بولتا ہے۔ پھر یہ نظمیں محض قدرتی مناظر کی عکاسی نہیں ہیں بلکہ انسان اور فطرت کا ایک خوبصورت ارتباط ان نظموں میں نظر آتا ہے۔

میں نے احباب کی محفلوں میں اکثر کہا ہے کہ جس طرح حالی کی غزل کو ابھی تک ان کے مسدس اور دیگر ''نیچرل'' اور اصلاحی نظموں نے دبا رکھا ہے اسی طرح ضمیر کی غزل (اور نظم بھی) ان کی مزاحیہ شاعری تلے دبی پڑی ہے۔ یہ حادثہ ان سب اہلِ فن پر گزر جاتا ہے جو ایک سے زیادہ اصناف میں تخلیق کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ ضمیر کی غزل نگاری ہی کی دین ہے کہ وہ اتنے بہت سے اصنافِ شاعری میں رواں دواں تھے۔ بہت کم شاعروں نے اس سلیقے کی غزل کہی ہوگی۔ زندگی کے دکھوں اور انسان کی محرومیوں اور اقدار کی پامالی اور معاشرے کی بے حسی اور محبت کی افتاد---کون سا موضوع ہے جسے ضمیر کی غزل میں جگہ نہیں ملی اور پھر ان موضوعات کو ضمیر نے اتنی استادانہ مہارت سے

ہوتا۔ تاہم کسی مقام پر بھی مجھ کو بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ اس دور کے ایک بہت بڑے مزاح نگار شاعر کی غزل ہے۔ البتہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی مزاح نگاری کا بھید ضرور فاش کر دیا:

کتنے آنسو پی گیا ہوں مسکرانے کے لیے

ضمیر کے اس اعتراف سے اہلِ علم و فن کے اس موقف کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مزاح نویسی دراصل مزاح نویس کے دکھ درد، محرومی اور اداسی کا ایک پردہ ہوتی ہے۔

نظم نگاری اور غزل گوئی میں اس مہارت کے علاوہ ضمیر نے ایک اور حوالے سے بھی اردو شاعری کو بڑی سربلندی عطا کی۔ یہ پنجابی شاعری کو اردو شعر میں منتقل کرنے اور پنجابی کی بعض مشہور بحروں میں اردو شاعری کرنے کا حوالہ ہے۔ اس میدان میں بھی ضمیر منفرد نظر آتے ہیں۔ سید محمد شاہ کے خوبصورت دوہڑوں اور حضرت میاں محمد بخش کے شاہکار "سیف الملوک" کے بعض حصوں کو ضمیر نے اردو شاعری کا جو جامہ پہنایا اس پر میں بحیثیت شاعر رشک بھی کرتا ہوں۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ اگر سید محمد شاہ اور میاں محمد بخش اردو میں شاعری کرتے تو یہ شاعری اس شاعری سے کیسے مختلف ہوتی جس میں ضمیر نے ان کے کلام کو منتقل کیا۔

ضمیر نے اخبار نویسی بھی کی۔ وہ کالم نگاری کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے معاصرین کے نہایت شگفتہ اور دلچسپ اور سچے خاکے بھی لکھے اور اپنی مزاح نگاری کا لوہا منوا لیا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک ناولٹ بھی لکھ چکے تھے یا لکھ رہے تھے۔ اسے پڑھے بغیر میں آنکھیں بند کر کے یہ اعلان کرنے کو تیار ہوں کہ یہ ناولٹ بھی ان کی سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری اور شعری تراجم کی طرح کامیاب اور دل و دماغ کو گرفت میں لے لینے پر قادر ہوگا۔

ان کی جملہ تخلیق کاریوں پر وطن کے لیے ان کی نغمہ نگاری مستزاد ہے۔ ''زیورِ وطن'' کے نام سے ان کا جو مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے اسے ہمارے اسکولوں میں بطورِ نصاب شامل ہونا چاہیے کہ وطن سے غیر مشروط محبت کے یہ دلآویز نغمے یک جا اور کہیں نہیں ملیں گے۔

یہ تھے ہمارے شاعر اور مزاح نگار اور کالم نویس اور اخبار نویس اور مترجم اور کردار نگار اور محفل آرا اور جانِ انجمن سید ضمیر جعفری' جنہیں ایک نظر دیکھ کر بھی کچھ اور زندہ رہنے کو جی چاہتا تھا کہ زندگی کا حُسن اور محبت اور گہما گہمی اور شگفتگی اس ایک شخص میں مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔ ضمیر محبتوں کا کروڑ پتی بھی تھا اور تخلیقی صلاحیتوں کا جزیرہ بھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جنت الفردوس میں مقیم ہوگا۔

# سیّد امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج مرحوم سے میرا تعارف اُس زمانے میں ہوا جب میں ۱۹۳۵ء میں گریجویشن کے بعد لاہور میں بے روزگاری کے دن گزار رہا تھا اور یہ بے روزگاری آج کی طرح اُس زمانے میں بھی متوسط طبقے کا مقدر تھی۔ اُن سے ملاقات سے پہلے میں ان کے ڈرامے ''انارکلی'' کے علاوہ ''چچا چھکن'' اور کئی مغربی افسانوں کے تراجم پڑھ چکا تھا۔ میرے ادبی سفر کا آغاز تھا اس لیے ظاہر ہے کہ میں اُس دور کی ایک معروف ادبی شخصیت کے دبدبے کی زد میں بھی تھا۔ البتہ میرے پیر و مرشد مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے امتیاز صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات کا مرحلہ آسان بنا دیا۔ سالک صاحب ہی مجھے دارالاشاعت پنجاب کے دفتر میں امتیاز صاحب کے پاس لے گئے اور ان سے ہفتہ وار ''تہذیب نسواں'' کے لیے بعض نسوانی انگریزی رسائل کی کہانیوں اور مضامین کے ترجمے کا کام لے دیا۔ میں ہفتے عشرے کے بعد کوئی ترجمہ مکمل کر کے امتیاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ اسے ایک نظر دیکھتے اور پھر فوری طور پر معاوضے کا بندوبست کر دیتے۔ ان رسمی اور کاروباری ملاقاتوں کے دم سے میرا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ امتیاز صاحب خوب صورت آدمی ہیں اور خوب صورت باتیں

کرتے ہیں۔ اس حقیقت کا علم مجھے کچھ عرصہ بعد ہوا کہ امتیاز صاحب کے ظاہر کی طرح ان کا باطن بھی خوب صورت ہے اور ان کی شخصیت تہذیب اور شائستگی کے علاوہ خوش مزاجی اور شگفتگی کا ایک دلآویز امتزاج ہے۔

اسی دوران میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''چوپال'' بھی امتیاز صاحب کے ادارے دارالاشاعت پنجاب ہی کی طرف سے شائع ہوا۔

۱۹۳۱ء میں اپنی پہلی نظم کی اشاعت اور ۱۹۳۹ء میں اپنی پہلی کتاب کی اشاعت پر مجھے بے پایاں مسرت کا وہ تجربہ حاصل ہوا جو نئے اہلِ قلم کے حوصلے و ہمت کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ ''چوپال'' خاصے اہتمام سے شائع ہوئی تھی۔ سالک صاحب نے اس کا تعارف اور امتیاز صاحب نے اس کا مختصر سا دیباچہ لکھا۔ اس دیباچے کے ایک جملے کا مفہوم مجھے آج بھی ازبر ہے کہ ''ندیم قاسمی کی اس ابتدائی کوشش کو دیکھ کر ہر پڑھنے والے کو بے اختیار اس امر کا احساس ہوگا کہ اُردو ادب مستقبل کے ایک بڑے مصنف سے روشناس ہو رہا ہے۔'' یہ بحث دوسری ہے کہ میں امتیاز صاحب کی اس پیش گوئی کو صحیح ثابت کر سکا ہوں یا نہیں لیکن اس ایک جملے میں خود امتیاز صاحب کی بڑائی یقیناً جھلک رہی ہے۔

۱۹۳۹ء میں مجھے ایک ایسی سرکاری ملازمت مل گئی جس کا علم و ادب سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ میں نے ملازمت کے یہ دو ڈھائی برس انتہائی بے چینی اور کرب میں بسر کیے۔ مولانا سالک کو اس کا علم تھا کیونکہ وہی میری فریادگاہ تھے اور میں انھی کے سامنے کھل کر رو پیٹ سکتا تھا۔ وہ میری ہمت بندھاتے اور تسلیاں دیتے رہے اور آخرکار ایک خوشگوار صبح کو مجھے ان کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ لاہور آ کر ہفتہ وار ''تہذیب نسواں'' اور ہفتہ وار ''پھول'' کی ادارت سنبھال لو۔ میں مستعفی ہو کر ملتان سے بھاگا اور ۱۹۴۲ء میں

دارالاشاعت پنجاب سے منسلک ہوگیا۔ اس طرح بعد کے قریب قریب چار سال میں نے امتیاز صاحب کے ہمراہ بسر کئے اور اس دوران میں مجھے ان کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

یہاں ایک دلچسپ صورت حال کی وضاحت ضروری ہے کہ جب میں دارالاشاعت میں پہنچا تو ایک دو دنوں کے اندر مجھے اندازہ ہوگیا کہ سارا عملہ امتیاز صاحب سے محبت کرتا ہے اور ان کے بڑے بھائی سید حمید علی سے ڈرتا ہے چنانچہ عملے کو موسم گرما کا شدید انتظار رہتا تھا جب سید حمید علی گرمیاں گزارنے مری کی طرف چلے جاتے تھے اور دارالاشاعت کا انتظام امتیاز صاحب کے سپرد ہو جاتا تھا۔

"پھول" اور "تہذیب نسواں" پر ایڈیٹر کی حیثیت سے امتیاز صاحب ہی کا نام چھپتا تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے میرے مرتب کئے ہوئے پرچے ناقدانہ نظر سے دیکھے لیکن اس کے بعد تین چار برس میں مجھے وہ دن کبھی یاد نہیں جب انہوں نے میرے انداز ترتیب پر نکتہ چینی کی ہو یا مندرجات میں سے کسی ایک کو بھی قابل اعتراض ٹھہرایا ہو۔ صرف "تہذیب نسواں" وغیرہ چھپ جانے کے بعد ان میں کبھی کبھار کوئی بحث چھڑ جانے کے سلسلے میں مجھ سے گفتگو کرتے تھے۔ اس بحث کا آغاز بھی میری طرف سے کم اور کسی کی طرف سے ہوتا تھا۔ وہ مضمون چھپتا تو وہ بحث میں حصہ لینے والی خواتین کے مضامین کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ پھر جب یہ بحث دم توڑنے لگتی تھی تو ہم بحث کا کوئی نیا موضوع سوچتے تھے اور ایک بار پھر تائید و مخالفت سے بھرے ہوئے مضامین کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک بحث کا آغاز کیا۔ امتیاز صاحب کی ایک رشتہ دار خاتون لاہور میں مقیم تھیں۔ شاید ان کا نام [illegible] تھا۔ اچھے افسانے لکھتی تھیں

جو رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے اختلاف کا اظہار کیا۔ ان کا مضمون درج کرنے کے بعد اگلے ہفتے میں نے اس کا جواب لکھا۔ جس روز پرچہ بازار میں آیا مجھے امتیاز صاحب نے اپنے کمرے میں بلا بھیجا۔ وہاں سلطانہ صاحبہ بھی موجود تھیں۔ تعارف کرایا اور ایک بلیغ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ انہیں آپ سے کچھ کہنا ہے۔ وہ غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ ٹوٹ پڑیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا بہتر یہ نہیں ہوگا کہ ہم صرف تہذیب نسواں کے صفحات پر لڑیں۔ اس پر وہ کڑک کر بولیں ''تو کیا میں لڑ رہی ہوں؟'' میں نے امتیاز صاحب کی تائید حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تو لڑائی اور کسے کہتے ہیں؟'' اور امتیاز صاحب بولے ''نہیں میرے خیال میں یہ لڑائی نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرح کا تبادلۂ خیالات ہے۔ لڑائی کی صورت تو اس وقت پیدا ہوتی جب سلطانہ کرسی اٹھا کر آپ کے دے مارتیں اور ابھی انہوں نے کرسی کی طرف تو ہاتھ بڑھایا ہی نہیں۔'' اس پر میں مسکرایا مگر سلطانہ ایک دم اس زور سے رونے لگیں کہ ملحقہ کمروں میں بیٹھے ہوئے اہل کار بھی چونک پڑے۔ امتیاز صاحب نے مشکل سے انہیں خاموش کرایا۔ میں نے بھی معذرت کی تو وہ بولیں ''تو آپ وعدہ کر رہے ہیں کہ آپ آئندہ میرے ساتھ بحث میں نہیں الجھیں گے۔'' میں نے عرض کیا کہ میری معذرت کا مطلب آپ غلط سمجھیں۔ میں نے تو معذرت کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ اگر اس گفتگو میں مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجیے۔ رہی بحث تو وہ تو جاری رہے گی۔ میں تو یہ کہنے کے بعد سلطانہ صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر بھاگ آیا مگر بعد میں امتیاز صاحب نے میرے کمرے میں آ کر مجھے مبارک باد دی کہ میں نے ایک اچھے ایڈیٹر کا طرزِ عمل اختیار کیا۔

ایک دن مشہور افسانہ نگار اور میرے عزیز دوست کرشن چندر تشریف

لائے۔ وہ ان دنوں ''نئے زاویے'' کی پہلی جلد مرتب کر رہے تھے۔ انہیں اس مجموعے کے لیے امتیاز صاحب کے ڈرامے کی ضرورت تھی مگر وہ امتیاز صاحب سے متعارف نہیں تھے اس لیے انہوں نے میرا توسط اختیار کیا۔ میں نے جب امتیاز صاحب کو بتایا کہ کرشن چندر آپ سے ملنے آئے ہیں تو انہوں نے اتنی مسرت کا اظہار کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ کچھ لکھ رہے تھے مگر قلم رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''کہاں ہیں کرشن چندر؟ بلایئے انہیں۔ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ انہیں ساتھ ہی کیوں نہیں لے آئے؟'' میں کرشن چندر کو لے آیا تو امتیاز صاحب ان سے اتنی محبت اور اپنائیت سے ملے کہ کرشن کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ میں نے ہی امتیاز صاحب سے کرشن چندر کی آمد کا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ''نئے زاویے'' کے لیے ڈرامہ ضرور لکھیں گے۔ اس کے بعد وہ کرشن کے افسانوں کی تعریف کرنے بیٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک ندی ہے جو گلپوش جھاڑیوں سے لدی ہوئی ایک وادی میں حدِ نظر تک بہے جا رہی ہے۔ ادبی اور فنی موضوعات پر امتیاز صاحب اتنی روانی سے بولتے تھے اور بولتے چلے جاتے تھے کہ ان کے شوق کی بے ساختگی اور ان کے مطالعے کی وسعت پر حیرت ہوتی تھی۔ آخر ہم ان سے رخصت ہوئے۔ کرشن چندر میرے ہمراہ میرے کمرے میں آ کر بیٹھے تو گویا کرسی پر گر پڑے اور بولے ''یار ندیم! جلدی سے ایک گلاس پانی پلاؤ' بلکہ دو گلاس منگاؤ' ایک گلاس پلاؤ اور ایک گلاس میرے سر پر انڈیل دو۔ میں تو چکرا کر رہ گیا ہوں۔ یار حد ہوگئی۔ ہم اُردو کے افسانہ نگار کہلاتے ہیں۔ اُردو روانی سے لکھتے ہیں مگر اُردو کا ایک جملہ بولنا پڑے تو جگہ جگہ رکتے ہیں۔ اور ادھر سید امتیاز علی تاج ہیں کہ اُردو بولنے لگے تو بولتے ہی چلے گئے۔ یار ایک بات کہوں۔ سید امتیاز علی تاج کو کتنی اچھی اور کتنی بہت سی اُردو آتی ہے!'' ----- بعد میں جب میں نے امتیاز صاحب کو کرشن کے اس ردعمل سے

مطلع کیا تو خوب ہنسے اور مجھ سے کہا "کرشن سے پھر ملیں تو ان سے کہیے گا کہ اُردو کے معاملے میں ہمارا پلہ کسی صورت میں بھاری نہیں ہے۔ ہم لوگ اہل زبان ہیں، تو آپ لوگ اہلِ بیان ہیں!"

امتیاز صاحب کی زندہ دلی اور شگفتہ طبعی کا ایک اور واقعہ سنیے۔ میرے کمرے میں دو خوش نویس بھی کام کرتے تھے۔ رام پور کے منشی تہور علی "تہذیب نسواں" کی کتابت کرتے تھے اور منشی فرزند علی جو موچی دروازے کے باشندے تھے، سالہاسال سے "پھول" کی کتابت کر رہے تھے۔ منشی تہور علی شمس العلما سید ممتاز علی مرحوم کے زمانے سے دارالاشاعت میں کتابت کر رہے تھے۔ منشی فرزند علی شوخ اور ہنس مکھ تھے۔ ان کے مقابلے میں منشی تہور علی ہمہ وقت پان کھاتے رہتے تھے اور کھل کر شاید اس لیے نہیں ہنستے تھے کہ پان کی پیک ان کے منہ میں چلّوؤں کے حساب سے جمع رہتی تھی۔ پھر جب وہ کھڑکی میں سے باہر اس پیک کو تھوکتے تھے تو جو آواز پیدا ہوتی تھی، اس سے متاثر ہو کر سالک صاحب نے منشی تہور علی کا نام "منشی تھور علی" رکھ دیا تھا۔

منشی فرزند علی کو کچھ پیشگی رقم کی ضرورت پڑی۔ سید حمید علی کشمیر گئے ہوئے تھے۔ چارج امتیاز صاحب کے پاس تھا۔ منشی فرزند علی ہیڈ کلرک کے پاس گئے جس نے یہ کہہ کر پیشگی دینے سے انکار کر دیا کہ "سید حمید علی صاحب کا حکم ہے کہ مہینے کی دسویں سے پہلے کوئی تنخواہ، کوئی پیشگی نہیں دی جا سکتی اور میں حکم کا بندہ ہوں۔" منشی فرزند علی نے منتیں کیں کہ ضرورت شدید ہے، مہربانی کیجیے، مگر ہیڈ کلرک نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ اس پر منشی فرزند علی نے تنگ آ کر موچی دوازے کی زبان میں کہا "نہیں، تم حکم کے بندے نہیں ہو۔ تم تو چڑیا کے غلام ہو۔" آس پاس بیٹھے ہوئے کلرک ہنسی پر ضبط نہ کر سکے اور ہیڈ کلرک غصّے سے پاؤں پٹختا ہوا امتیاز صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔

لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ استعفیٰ بخوشی منظور کرتا ہوں۔" انہوں نے یہ آخری جملہ درخواست پر لکھا اور دستخط کر دیے۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور جب منشی صاحب کو بتایا کہ آپ کا استعفیٰ منظور ہوگیا ہے تو انہوں نے جیسے چیخ ماردی۔ "منظور ہوگیا؟" وہ ایک دردناک حیرت سے بولے اور پھر جیسے ان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میں نے اور منشی فرزند علی نے انہیں دلاسا دیا' پانی پلایا اور جب وہ بولنے لگے تو ساتھ ہی رونے بھی لگے "یہ معاوضہ ملا ہے ہمیں ساری عمر اس ادارے کے لیے وقف کر دینے کا۔ سبحان اللہ ! کیا قدر دانی ہے ! کیا جوہر شناسی ہے !" میں انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر سالک صاحب کی طرف بھاگا' جن کا دفتر قریب ہی خالصہ سٹریٹ میں تھا۔ انہوں نے سنا تو بے حد اداس ہوگئے۔ چھڑی اٹھائی' مجھے ساتھ لیا' سیدھے امتیاز صاحب کے کمرے میں گئے اور ان پر ایسے برسے کہ خدا کی پناہ۔ امتیاز صاحب معذرت کرتے رہے اور کہتے رہے "نہیں سالک صاحب' میں نے تو ان سے محض دل لگی کی ہے ورنہ میں انہیں کیسے جانے دوں گا۔" پھر مجھ سے استعفیٰ کی درخواست لے کر پرزے پرزے کر دی۔ منشی تہورعلی کو بلایا اور ان سے باقاعدہ معافی مانگی۔

امتیاز صاحب کے مزاج اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس طرح کے بے شمار واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر سبھی کو دہرانا ممکن نہیں۔ آخر میں صرف ایک واقعہ سن لیجیے۔ "تہذیب نسواں" میں کبھی نذر سجاد حیدر صاحبہ اور کبھی حجاب امتیاز صاحبہ کے روزنامچے شائع ہوا کرتے تھے۔ ایک روز سالک صاحب میرے پاس بیٹھے "تہذیب نسواں" کا نیا شمارہ دیکھ رہے تھے جب حجاب صاحبہ کا روزنامچہ پڑھتے ہوئے اچانک چونکے اور چپڑاسی سے کہا کہ امتیاز صاحب کو بلا دو۔ امتیاز صاحب میرے کمرے میں پہنچے تو سالک صاحب نے چھوٹتے ہی کہا "حجاب بی بی سے کہیے روزنامچہ لکھا کریں تو سچ بولا کریں۔ روزنامچے میں افسانہ

نگاری نہیں چھپتی۔'' امتیاز صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا اور اس مشورے کی وجہ پوچھی تو سالک صاحب بولے ''یہ دیکھیے، لکھا ہے کہ سالک صاحب ہم سے ملنے آئے تو اس وقت میں اپنی دریچی میں کھڑی دریچی پر پھیلی ہوئی پھولوں لدی بیل کی جھریوں میں سے غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ جب میں پہنچا تھا تو وہ اپنے طوطے کو چوری کھلا رہی تھیں۔'' بس کچھ نہ پوچھیے کہ سالک صاحب کے اس ارشاد پر امتیاز صاحب کتنی بے اختیاری سے کتنا بہت ہنسے۔ یہ ان کی فراخ دلی، بزرگ دوست کے احترام اور شگفتہ مزاجی کا ایک ننھا سا ثبوت تھا۔

ان کے ادب و فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا اور لکھا جانا چاہیے۔ مجھے مختصراً صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اعلیٰ معیار کے ایک ڈرامے کے مصنف اور ریڈیو ڈراموں کے ایک بے مثال صداکار ہونے کے علاوہ امتیاز مرحوم نے اردو ڈرامے پر اور بھی بہت سے احسانات کیے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ قدیم اردو ڈراموں کا کوئی بھی مستند ایڈیشن دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی اردو میں ڈرامہ نویسی پر کوئی معقول کتاب موجود ہے، چنانچہ انہوں نے لکھنؤ کی اندر سبھا اور بمبئی کے ناٹکوں سے لے کر آغا حشر اور ان کے بعد کے ڈراموں کو مرتب اور طبع کرنے کا ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا جسے مجلس ترقی ادب نے اپنے طباعتی پروگرام میں شامل کر لیا۔ بعد میں خود امتیاز مرحوم، مجلس ترقی ادب کے ناظم مقرر ہو گئے چنانچہ ان کی نگرانی میں ان ڈراموں کے مستند نسخوں کی فراہمی اور ترتیب و اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔ ان ڈراموں پر امتیاز مرحوم نے بڑی محنت کی اور ان کے لیے معلومات افزا اور عالمانہ دیباچے لکھے۔ ان کے بے وقت انتقال کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ڈراموں کی چند اور جلدیں شائع ہوئیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم نے کام کو کسی حد تک آگے بڑھایا مگر پھر وہ بھی وفات پا گئے

اور ڈراموں کی طباعت میں عارضی طور پر رکاوٹ پیدا ہوگئی مگر اب ڈراموں کی طباعت کے اس کام کا احیا ہو چکا ہے اور آغا حشر کے ڈراموں کے مجموعے اور رفیع پیر کے ڈرامے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب تک ڈراموں کی جو پندرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے بیشتر اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع میں، بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ میں سٹیج ہو چکے تھے۔ ان میں خورشید، آرام، ظریف، رونق، حباب، حافظ عبداللہ، کریم الدین مراد، طالب بنارسی، آغا حشر اور رفیع پیر کے علاوہ ''نامعلوم مصنفین'' اور ''متفرق مصنفین'' کے ڈرامے شامل ہیں۔

اُردو ادب میں امتیاز مرحوم کی طرف سے یہ بہت بڑا اضافہ ہے۔ ادبی اعتبار سے ان ڈراموں کی اہمیت زیادہ نہ سہی مگر تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔ اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُردو کا دامن ڈرامے سے خالی ہے۔

امتیاز مرحوم کے ادب و فن کی صحیح تحسین کا کام ابھی شروع ہی نہیں ہوا۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ڈرامے کے فن سے بھی آشنا ہوں اور مجھ سے کہیں زیادہ مرحوم کے قریب بھی رہ چکے ہوں۔ شرافت، تہذیب، شائستگی اور خوش مزاجی کا یہ مرقع جس طرح اس دُنیا سے رخصت ہوا وہ ہم سب کے لیے دردناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ میں نے ان کی موت کی خبر سنی تھی تو کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے شگفتگی کی انتہا پر پہنچے ہوئے ایک پھول کو مسل ڈالا گیا ہے۔

❋❋❋
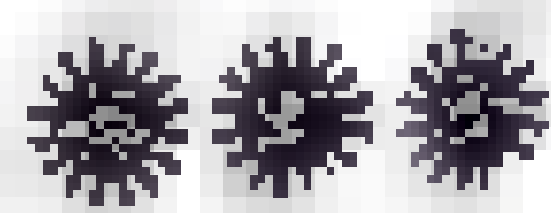
# حکیم محمد سعید

محترم حکیم محمد سعید صاحب کی سی کثیر الجہات شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا مہذب انسانوں کی معاشرتی سرگرمیوں کی جتنی بھی جہت ہو سکتی ہیں، ان سب کو حیطۂ تحریر میں لانے کے برابر ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ناممکنات کی حد تک دشوار کام ہے۔ ظاہر ہے کہ حکیم صاحب صرف ایک شخص، صرف یک ذات، صرف ایک فرد ہیں مگر مشکل یہ ہے ان کی صرف ایک یا دو یا دس سرگرمیوں کا ذکر کیجیے تو ان کی بیسیوں دوسری سرگرمیاں تشنۂ توجہ رہ جاتی ہیں اور یوں اس ایک فرد کے پھیلاؤ کو سمیٹنا، کم سے کم میرے لیے نہایت درجہ دشوار ہے، چنانچہ میں ان کی اکا دکا سرگرمیوں کا ذکر کروں گا اور یوں آج ان کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنے کا جو اعزاز بخشا گیا ہے، اس کے جواز کی کوئی صورت پیدا کروں گا۔

دشواری یہ ہے کہ معاشرے کی بہبود اور عالمِ انسانیت کی فلاح کے چیلنج تو تاریخِ انسانی میں بے شمار اصحاب نے قبول کیے ہیں مگر ان سب کی فلاحی جدوجہد کسی ایک شعبے میں محدود ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے آپ کو کوڑھیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے وقف کر دیتا ہے تو یہ انتہائی نیک کام

ہے اور اس ضمن میں اس شخص کی بھرپور تحسین ہونی چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جدوجہد ایک دائرے میں محدود ہے۔ مگر جو شخص ایک اعلیٰ پائے کا تجربہ کار معالج ہونے کے ساتھ ہی علم و حکمت' تہذیب و ثقافت' تعلیم و تربیت اور کردار و اخلاق کے شعبوں کو بھی اپنی سرگرمیوں میں شامل کرتا ہو اور ان شعبوں کی فلاح کی انتہا کر دیتا ہو' مگر ساتھ ہی طبابت کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے جاری رکھتا ہو' اور جو کروڑوں اربوں روپے کمانے کے باوجود نہایت درجہ سادہ زندگی گزارتا ہو' اور جو بچوں کے لیے لکھی ہوئی ڈائری میں خود بتاتا ہو کہ ----'' میں تو اپنی شیروانی اور کرتا پاجامہ بھی خود ہی دھو لیتا ہوں' اپنا بنیان اور اپنے موزے خود دھو کر ڈال دیتا ہوں' صبح میں اپنا غسل خانہ روزانہ خود ہی صاف کرتا ہوں اور ہر چیز چمکا کر آئینہ بنا دیتا ہوں'' تو ایسا شخص ایک فرد کہاں ہوا' وہ تو اپنی ذات میں ایک ادارہ ہے اور ایک وسیع اور بھرپور ادارے کے خدوخال کو چند سطور میں بیان کرنے کے لیے دانش و حکمت کی وہ قوتیں درکار ہوتی ہیں جو میرے خیال کے مطابق مجھ میں کماحقہٗ موجود نہیں ہیں۔

محترم حکیم محمد سعید صاحب کی تاریخ پیدائش ۹۔ جنوری ۱۹۲۰ء ہے چنانچہ جب آزاد پاکستان وجود میں آیا تو وہ چھبیس ستائیس برس کے ایک ایسے نوجوان تھے جنہیں ہر طرح کی آسائش میسر تھی اور دولت و ثروت ان کے گھر کی باندیاں تھیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پاکستان سے محبت ان کے جسم میں خون کی طرح رواں تھی چنانچہ وہ یہ سب دولتیں اور آسائشیں تج کر پاکستان آ گئے۔

کراچی میں اعوان لاج کے ایک چھوٹے سے کمرے میں انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا (چلتے چلتے مجھے اس امر پر خوش ہو لینے دیجیے کہ میں اعوان ہوں اور محترم حکیم صاحب کا آغاز کار اعوان لاج سے وابستہ ہے) پھر آرام باغ روڈ کے ایک کمرے میں انہوں نے ہمدرد مطب قائم کیا۔ کمرہ بھی

کرائے کا تھا اور اس کا فرنیچر بھی کرائے کا تھا اور یاد رہے کہ یہ اس شخص کی اقامت گاہ تھی جو دہلی میں امارت کی اونچی مسند چھوڑ کر آیا تھا۔ یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے اور پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ مطب اگرچہ ایک فرد واحد کی ملکیت تھا مگر اس عجیب و غریب فرد واحد نے چار پانچ سال بعد ہی ۱۹۵۳ء میں مطب کو وقف قرار دے دیا اور یوں اپنا سب کچھ قوم کے سپرد کر دیا۔ تب سے اب تک کی داستان بہت طویل ہے مگر یہ ایک ایسی داستان ہے جس کی گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ میں نظیر پیش کرنا مشکل ہے۔

آج مدینۃ الحکمت اس عظیم خواب کی ہمہ گیر تعبیر کی صورت میں سرزمین کراچی سے ابھرا ہے' جو محترم حکیم محمد سعید صاحب نے کراچی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں کرائے کے کمرے اور کرائے کے فرنیچر کے ماحول میں دیکھا تھا۔ یہ سارا کمال ان کی جرأت اور حوصلہ مندی کا ہے' ان کی تہذیب اور شائستگی کا ہے' ان کی دیانت اور خوداعتمادی کا ہے' ان کے پاکیزہ مقاصد اور ان کی محیر العقول اور ان تھک محنت کا ہے۔ محنت اور مسلسل محنت نے محترم حکیم محمد سعید صاحب کے وجود میں تجسیم پائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت قائداعظم نے جب قیام پاکستان کے دنوں میں نئی پاکستانی قوم کے سامنے کام' کام اور زیادہ کام' کا نعرہ سر کیا تھا تو حکیم صاحب نے اسے اپنے باطن میں اتار لیا تھا چنانچہ انہوں نے اتنی محنت کی ہے اور آج ۷۴ برس کی عمر میں بھی اسی معیار کی محنت کر رہے ہیں کہ ہم شما ایسی کارکردگی کا تصور بھی کریں تو ان کے دماغ کی نسیں پھٹنے پر آ جائیں۔

اپنی ذات کی نفی کر کے دوسروں کے لیے اپنی محنت اور لگن کی کمائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وقف کر دینا' انسانی حقوق کے پاس و احترام کا ایک معجزہ ہے جو محترم حکیم محمد سعید صاحب نے حیرت انگیز استقامت سے سر کیا ہے۔ طبابت کا

سلسلہ ان کی جملہ دیگر سرگرمیوں کے باوجود باقاعدگی سے اب تک جاری ہے چنانچہ وہ اب تک تیس لاکھ مریضوں کا علاج فرما چکے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ مفت طبی مشورہ دیا ہے اور ہمارے ایلوپیتھک متخصصین کی طرح تین منٹ کے مشورے کے تین تین سو اور چھ چھ سو روپے مریضوں سے کبھی نہیں اینٹھے۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے وفاقی حکومت کا وزیر ہونے کے دنوں کے علاوہ صوبہ سندھ کی گورنری کے دنوں میں بھی پاکستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مریضوں کو نہایت شفقت سے مشورے دیے اور علاج تجویز کرنے کا کام باقاعدگی سے جاری رکھا۔

اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب موصوف کو کامرانیوں پر کامرانیاں عطا کی ہیں۔ قدم قدم پر انہیں ان کے ہر خواب کی تعبیر مل رہی ہے۔ ایک ایک کر کے بظاہر ان کے سبھی خواب پورے ہو چکے ہیں اور اب ان خوابوں کی تکمیل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت وہ ہمدرد فاؤنڈیشن کے صدر ہیں۔ ہمدرد یونیورسٹی کے بانی چانسلر ہیں۔ ہمدرد لیبارٹریز کے بانی' صدرنشین ہیں۔ چالیس کے قریب اردو کتابوں کے اور تیس کے قریب انگریزی کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری پچاس ہزار کتابوں پر مشتمل ہے اور اب انہوں نے اپنی یہ لائبریری ہمدرد یونیورسٹی لائبریری کے حوالے کر دی ہے۔ اس لائبریری کے لیے اب تک ساٹھ لاکھ روپے کی کتابیں خریدی جا چکی ہیں۔

انہوں نے مدینۃ الحکمت کے نام سے تہذیب و ثقافت اور علم و فن کا پورا شہر بسا دیا ہے اور اس مفروضے کی عملاً تنسیخ کر دی ہے کہ:

بستی بسنا کھیل نہیں' بستے بستے بستی ہے

انہوں نے تو یہ بستی بسانا ادھر طے کیا اُدھر بستی زمین کے سینے میں سے کھمبیوں کی طرح اُگ آئی۔ اس مدینۃ الحکمت میں ہمدرد پبلک سکول ہے جس میں بیک وقت پانچ ہزار بچے تعلیم پاتے ہیں۔ دو ہزار بچوں کے لیے یتیم خانہ الفرقان

ہے۔ دس ہزار طلبا پر مشتمل ہمدرد یونیورسٹی ہے۔ ہمدرد میڈیکل کمپلیکس ہے۔ ہمدرد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے جس میں پودوں اور جڑی بوٹیوں کے خواص کی تحقیق کا کام جاری رہتا ہے۔ سائنس میوزیم ہے۔ سپورٹس سٹیڈیم ہے۔ بچوں کا ملے لینڈ ہے۔ یوتھ سنٹر ہے۔ ہمدرد لائبریری ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ہمدرد طبیہ کالج ہے۔ ہر قوم کے محققین کی سہولت کے لیے آرام دہ رہائش گاہیں تعمیر ہو چکی ہیں' اور یہ سب ادارے رنگ' نسل اور نظریہ و عقیدہ سے ماوراء عالمِ انسانیت کے لیے وقف ہیں۔ حکیم صاحب ۷۵ غیر ملکی کانفرنسوں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ تیس سال سے شامِ ہمدرد کا سلسلہ ملک کے ہر شہر میں جاری ہے۔ امریکہ' کینیڈا' برطانیہ' فرانس' روس' چین' جاپان' ناروے' سویڈن' ڈنمارک' جنوبی امریکہ' کوریا' انڈیا۔۔۔۔غرض پورے کرۂ ارض کے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور خالی دورہ کر کے واپس نہیں آئے بلکہ سفرناموں کی صورت میں کتابیں لکھی ہیں اور اپنے مشاہدات و تجربات کو نسلوں کے حوالے کیا ہے۔ طب کے بارے میں بعض با اثر لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کے سلسلے میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔ نتیجتاً اطبا اور ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کا اتحاد قائم ہو چکا ہے اور اب طب کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے والے ختم ہو چکے ہیں

محترم حکیم محمد سعید صاحب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف قوم اور حکمرانوں کو متوجہ کر کے اس صدی کی ایک شدید ضرورت کو پورا کیا ہے۔ بچوں کے ساتھ ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ "ہمدرد نونہال" کے ایک دو اجتماعوں میں شرکت کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ حکیم صاحب قبلہ بچوں کے محبوب ہیں۔ اب انہوں نے شاعری کی قوتِ خیر کے اعتراف کے طور پر ہر شہر میں ہر ماہ ملک بھر کے شعراء کو تحسین کے پھولوں سے لادنا شروع کر رکھا ہے۔ آوازِ اخلاق کی تحریک کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ ہے کہ ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے رہنے

والے اسلامی اخلاق سے بھی دستبردار ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور محترم حکیم صاحب نے ہمارے زوال کا اندازہ لگا کر یہ تحریک شروع کر رکھی ہے۔

غرض محترم حکیم محمد سعید صاحب کی سرگرمیوں کے کس کس شعبے کا ذکر کیا جائے کہ سبھی شعبوں کے تذکرے کے بعد بھی اتنے ہی شعبے بچ رہتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ان کے یہ کمالات غیر زمینی اور غیر انسانی لگتے ہیں جبکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اسی زمین پر بسنے والے انسانوں ہی کی حق رسی کے لیے کیا ہے۔ البتہ میں یہ کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''سپر ہیومن'' صفات سے نواز رکھا ہے اور انہوں نے ہماری ۴۷ برس کی سیاہ اندھیری تاریخ میں خدمتِ خلق کا ایک ایسا آفتاب روشن کر رکھا ہے جو غروب ہونا جانتا ہی نہیں۔

آخر میں مجھے ایک ایسی بات کہنی ہے جس سے محترم حکیم صاحب کو بھی مجھ سے شکایت ہوسکتی ہے مگر میں ان سے معذرت کے ساتھ کہوں گا ضرور۔ عرض یہ ہے کہ اتنی حیرت ناک خدمات کے باوجود ہماری حکومت کی طرف سے محترم حکیم صاحب کو ابھی تک صرف ستارۂ امتیاز کا اعزاز ملا ہے اور یہ اعزاز ایسا ہے جو مجھ جیسے شعر ساز اور افسانہ نگار کو بھی مل چکا ہے۔ تو ہم سب کو شرم آنی چاہیے کہ حکیم صاحب تو پاکستان کے سب سے بڑے اعزاز کے مستحق ہیں' مگر واضح رہے کہ یہ اعزاز محترم حکیم صاحب کی شخصیت میں کوئی اضافہ نہیں کرے گا بلکہ خود اس اعزاز کا اعزاز بڑھے گا۔[۱]

(یہ تحریر حکیم محمد سعید صاحب کی موجودگی میں' لاہور میں برپا ہونے والی ایک تقریب میں پڑھی گئی)۔

---

۱۔ حکیم صاحب کی شہادت کے بعد انہیں پاکستان کا سب سے بڑا سول ایوارڈ ''نشان پاکستان'' ----- دیا گیا۔

***
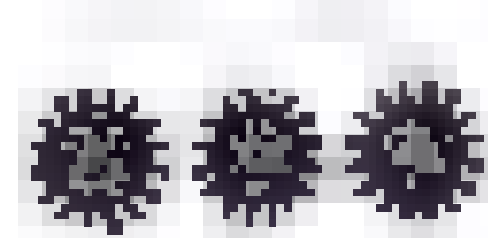
# خدیجہ مستور

خدیجہ کی شخصیت پر جو مضمون ہاجرہ نے لکھا اسے خدیجہ کی شخصیت کے بارے میں حرف آخر یقیناً نہیں کہا جا سکتا۔ خدیجہ کے حوالے سے کوئی اور ادیب تو اس پائے کی شخصیت نگاری شاید ہی کر سکے' لیکن ایک شخصیت یقیناً ایسی ہے جو خدیجہ کی شخصیت پر ہاجرہ سے بھی بہتر لکھ سکتی تھی اور وہ خود خدیجہ تھیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر خدیجہ نے کبھی اپنی سوانح عمری لکھی ہوتی تو وہ اُردو کے سوانحی ادب کے معیاروں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔ دراصل خود وشت سوانح کا اولین اور بنیادی مطالبہ سچ بولنا ہے اور خدیجہ دوسروں کے علاوہ خود اپنے بارے میں بھی اتنی بے خوفی سے بے ساختگی سے سچ بولنے کی عادی تھیں کہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ اس قسم کی پیش گوئی کر سکتا تھا۔ اس پیش گوئی کا ایک خودغرضانہ مقصد یہ واضح کرنا بھی ہے کہ میری یہ تحریر خدیجہ کا "کیریکٹر اسکیچ" نہیں ہے کیونکہ ہاجرہ کے لکھے ہوئے بھرپور شخصی خاکے کے بعد میں اس قسم کی جسارت کر ہی نہیں سکتا۔

خدیجہ کے فن پر حضرات فیض احمد فیض' سید احتشام حسین اور ڈاکٹر احسن فاروقی وغیرہ کے سے ماہرین نقد لکھ چکے ہیں اور مجھے تنقید نگاری کا قطعی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے مسائل ادب پر جو اکا دکا مضامین لکھے ہیں' وہ تنقیدی سے

زیادہ تاثراتی ہیں' اور یہ تاثرات ایک تخلیقی فن کار کے ہیں' تنقید نگار کے نہیں ہیں۔ چنانچہ میری اس تحریر کو ایک باقاعدہ تنقیدی مضمون بھی نہ سمجھا جائے۔

میں خدیجہ کی شخصیت سے بھی واقف ہوں اور ان کے فن کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ خدیجہ کی شخصیت اور فن کے بعض نمایاں رشتوں کی نشان دہی کروں۔ یہ نشان دہی میری نظر میں' اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ہمارے ہاں فن کار کے فن اور اس کی شخصیت کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر جائزہ لینے کا چلن عام ہے۔ اگر کسی فن کار کی شخصیت اس کے فنی موضوعات ونظریات کی نفی کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں قباحت ہی قباحت ہے۔ مثلاً اگر کوئی فن کار اپنے فن میں سرمایہ داری اور بڑی زمینداری کو (جسے غلطی سے جاگیرداری کے محدود مفہوم والا نام دے دیا جاتا ہے) انسان کی مادی اور روحانی ترقی کی راہ میں خوفناک رکاوٹ قرار دیتا ہے' مگر عملاً وہ ان اداروں کا محافظ ہے' تو میں اسے فن کار کی ریاکاری قرار دوں گا۔ اگر ایک شاعر محنت کی عظمت اور وقار کے گیت گاتا ہے مگر خود ایک تنکے تک کو توڑنے کی مصیبت سے گھبراتا ہے' تو وہ خلوص کے فقدان کا شکار ہے۔ فن' فن کار کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ شخصیت کسی دور افتادہ پہاڑ کی گپھا میں صورت پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس خاندان' اس طبقے' اس معاشرے اس قوم اور اس دور کے ان اثرات کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہر انسان پر پڑتے ہیں' مگر فن کار پر زیادہ شدت سے پڑتے ہیں کیونکہ وہ عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ یوں فن کار کے فن اور شخصیت کے رشتے بہت گہرے ہوتے ہیں اور آپس میں اتنے اُلجھے ہوئے' اتنے گُتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہو تو اس کے فن کے چہرے پر بھی خراشیں پڑ جاتی ہیں اور اس کی شخصیت بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ شخصیت اور فن کے یہی رشتے کسی فن کار کا اسلوب

اور انفرادیت متعین کرتے ہیں' بصورتِ دیگر جب فن کے اصول و قواعد اور اس کے مطالبات و مقتضیات یکساں ہیں تو غالب اور مومن کو' جوش اور حفیظ کو' فیض اور راشد کو ایک ہی رنگ' یک ہی قسم' ایک ہی نقطۂ نظر کا شاعر ہونا چاہیے تھا۔

خدیجہ اور ہاجرہ بہنیں ہیں۔ خدیجہ بڑی اور ہاجرہ چھوٹی مگر صرف ایک سال چھوٹی۔ دونوں کی پرورش اور تربیت ایک ہی گھر میں' ایک ہی ماحول میں ہوئی۔ دونوں نے اکٹھا افسانے لکھنے شروع کیے۔ یہ افسانے ایک سے رسالوں میں چھپے۔ دونوں اکٹھا ہجرت کر کے لکھنؤ سے لاہور آئیں۔ دونوں کی ایک ہی دن شادی ہوئی' دونوں کے شوہر ملک کے معروف اخبار نویس تھے۔ دونوں کے دو دو بچے تھے اور دونوں کے افسانوں کے چار چار مجموعے تھے۔ ہاجرہ نے اپنے ڈراموں کا مجموعہ ''وہ لوگ'' شائع کرایا تو خدیجہ نے ناول ''آنگن'' لکھ ڈالا۔ یوں دونوں کی تصانیف کی تعداد پانچ پانچ ہی ہے۔ دونوں کے ادبی نظریات ایک تھے۔ اس کے باوجود دونوں کے فن میں' دونوں کے مشاہدے میں' کرداروں کے انتخاب میں' پلاٹ کی تعمیر میں' حدیہ کہ زبان و بیان تک میں اتنا واضح فرق کیوں ہے؟ یہ دونوں کی شخصیتوں کا فرق ہے۔ ویسے تو عام نقادوں نے جب بھی خدیجہ اور ہاجرہ کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا' دونوں کو محض اس قصور کی پاداش میں ''بریکٹ'' کر دیا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں' اس لیے ایک کے فن کے جائزے میں دوسری کو بھی شریک کرنا ضروری ہے۔ یہ ادب کو بغور نہ پڑھنے اور آرام کرسی پر لیٹ کر تنقیدیں لکھنے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں بہنوں کے اسلوب میں معمولی فرق بھی نہیں' وہ فرق ہے جسے زمین و آسمان کا فرق کہتے ہیں۔ مگر یہ مقام اس فرق کو اجاگر کرنے کا نہیں ہے۔

خدیجہ کے مزاج کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ وہ لاہور کے جس محلے میں بھی رہیں' ان کے تعلقات ان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ انتہائی

دوستانہ رہے جنہیں خدیجہ ہی کے خاندان کے بعض بزرگ نفرت سے ''چوہڑوں چماروں'' کی عورتیں قرار دیتے تھے۔ خدیجہ پہلے نسبت روڈ پر رہیں' پھر جیل روڈ پر اور اس کے بعد کینال پارک میں۔ آخر میں وہ گلبرگ میں مقیم رہیں مگر ان کی دوستی اپنی قیام گاہ کے آس پاس کوارٹروں' جھونپڑوں اور چھپروں میں رہنے والیوں سے تھی۔ اعلیٰ طبقے کی بیگمات سے انہیں نفرت تو قطعی نہیں تھی کیونکہ انہیں کسی سے بھی نفرت نہیں تھی اور اگر ہوتی بھی تو بالکل عارضی ہوتی مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان سے دوستی نہیں رکھ سکتی تھیں۔ دراصل ان کی دوستی ہر شخصیت کے اندر کے انسان سے ہوتی تھی مگر بیشتر بیگمات جسمانی اور روحانی طور پر اس مبالغے کی حد تک لپی اور تھپی ہوئی ہوتی ہیں کہ خدیجہ سے ان کا ٹھیک سے تعارف ہی نہیں ہو پاتا تھا البتہ خدیجہ کا مشاہدہ اپنا کام جاری رکھتا تھا۔ انہیں اس امر کا احساس ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ یہ جو خدیجہ خلا میں نظریں گاڑے ان کی باتوں پر ہوں ہاں کیے جا رہی ہیں' تو دراصل خدیجہ نے ان کی روحوں کو آپریشن ٹیبل پر لٹا رکھا ہے' اور ان کے مشاہدے کے ہاتھوں میں نشتر ہیں۔ خدیجہ کے ہاں بیگمات کا مصرف بس یہیں تک ہے چنانچہ ان کی اصل دوستی یا تو اپنے طبقے کی اکا دکا خوش قسمت خواتین سے ہوتی تھی یا ان مزدوروں اور محنت کشوں کی ماؤں' بیویوں اور بیٹیوں سے جو قطعی غیر شعوری طور پر ان کے فن کے لیے خام مواد مہیا کرتی رہتی تھیں۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ خدیجہ' جو ذہنی طور پر اکثر اس مقام سے غائب رہتی تھیں جہاں وہ جسمانی طور پر بیٹھی ہوتی تھیں' ان غریب عورتوں کی توجہ اور محبت کا مرکز کیوں تھیں۔ برسوں کے تجربے کے بعد میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جب میں ان کی موجودگی میں انہی کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوتا تھا تو وہ میری باتیں نہیں سن رہی ہوتی تھیں بلکہ کہیں دور پہنچی ہوئی ہوتی تھیں۔ پھر انہوں

نے اپنے مشہور افسانے "ہینڈ پمپ" کی چنی بیگم کا اتنا گہرا اور ہمہ گیر مطالعہ کیسے کر لیا اور انہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ جب گٹھیا کی وجہ سے چنی بیگم کے گھٹنے سوج جاتے تھے تو چٹکنے لگتے تھے۔ خدیجہ جو عموماً "غائب" رہتی تھیں' ان لوگوں کے سینے میں اتنی شدت سے "حاضر" کیوں تھیں' اس کا راز ان کی شخصیت کے اس پہلو میں مل سکتا ہے کہ وہ اخبار بھی پڑھتی تھیں تو رو دیتی تھیں۔ کراچی میں ایک بچہ رکشے کے نیچے آ کر مر گیا اور خدیجہ بیٹھی دھاروں دھار رو رہی ہیں۔ راولپنڈی میں ایک جوان لڑکی نے شادی کے تیسرے دن بعد گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی اور خدیجہ کے آنسو رو کے نہیں رکتے۔ لاہور میں ایک مریض نے میو ہسپتال کے برفٹ پاتھ پر دم توڑ دیا اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے والی خدیجہ کا جی چاہ رہا ہے کہ وہ اس کے جنازے میں شریک ہوں۔ بے بسی اور محروموں سے ان کی یہ ہمدردی اس لیے نہیں تھی کہ بڑے لوگوں کی طرح انہیں ان بے بسوں اور محروموں پر ترس آتا تھا۔ ترس کھاتا تو اس سرمایہ دارانہ معاشرے کا ایک فیشن ہے جس کو بدلنا خدیجہ کی عزیز ترین آرزو تھی۔ دراصل خدیجہ ان کرداروں سے اپنائیت محسوس کرتی تھیں۔ انسانی اپنائیت! وہ سوچتی تھیں کہ یہی انسان اگر بہتر معاشرے کے خوشگوار ماحول میں ہوتے تو ممکن ہے' وہ ملک و قوم اور انسانیت کے لیے ہم سب سے بہتر ثابت ہوتے۔ پھر خدیجہ کی یہ اپنائیت کھوکھلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی محدود سی گنی بندھی آمدنی میں سے ہر ممکن بچت کو ان بے بسوں اور محروموں پر چپکے سے یوں صرف کرتی رہتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ یہ سب کچھ یوں نہیں دیتی تھیں جیسے بھیک دے رہی ہوں۔ یوں دیتی تھیں جیسے ایک ایسی نیکی یا فرض ادا کر رہی ہوں جس کی اتفاق سے ---محض اتفاق سے --- اتنی آمدنی ہے کہ وہ کسی کی محتاج نہیں ہے اور بس۔

خدیجہ کی شخصیت کی اس خصوصیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مجلس سے...

وہ اپنے گھر کے کسی ملازم کو دھتکارتیں۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں کہ کشمیر یا مری کی طرف سے پانچ پانچ سات سات سال کے غریب بچے لاہور میں روزگار ڈھونڈنے آئے اور خدیجہ کے پاس پہنچے تو چند ہی دنوں کے اندر ان کے چہرے سرخ ہوگئے اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر ان کی تربیت ہونے لگی۔ انہیں تعلیم دی جانے لگی۔ انہیں آداب اور قسم قسم کے کھانے پکانے کے طریقے سکھائے جانے لگے اور جب وہ جوان ہوئے تو خدیجہ نے اپنے شوہر ظہیر بابر کی مدد سے انہیں کہیں اچھا سا روزگار دلا دیا۔ میں گذشتہ سالہا سال سے دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملازم خدیجہ کے گھر سے جا کر بھی اس گھر کے خادم رہے۔ مجھے ایک بھی ایسی مثال یاد نہیں ہے جب خدیجہ نے کسی ملازم کو خفا ہو کر جواب دے دیا ہو۔ خفا وہ ضرور ہوتی تھیں مگر ملازم کو معلوم ہوتا تھا کہ بیگم صاحبہ ابھی چار پانچ منٹ کے اندر اس خفگی کی تلافی کے لیے تشریف لے آئیں گی۔

خدیجہ کے مزاج کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کرداروں کا تنوع حیران کن ہے۔ چھیڑنے کو تو میں انہیں اکثر کہتا رہتا تھا کہ آپ چولھے ہنڈیا سے ہٹ کر کیا خاک افسانے لکھیں گی، مگر سچی بات یہ ہے کہ جو رنگارنگی اور گوناگونی خدیجہ کے افسانوں کے کرداروں اور موضوعات میں ہے وہ کم سے کم اُردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں تو مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خدیجہ کو اپنی کہانیوں کے کردار گھڑنے نہیں پڑتے تھے۔ یہ جیتی جاگتی صورت میں ہر وقت ان کے آس پاس موجود رہتے تھے۔ ان کے یہ کردار ''دادا'' اور ''دس نمبری'' سے لے کر ''بورکا'' اور ''لعنتی'' تک پھیلے ہوئے ہیں۔

خدیجہ کے ہاں افسانوں کے موضوعات اور کرداروں کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ افسانہ لکھنے کی خاطر ان کے لیے صرف یہ کام باقی رہ جاتا تھا کہ وہ قلم اٹھائیں اور لکھنا شروع کر دیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ لکھنؤ کی رہنے والی

تھیں، زبان پر انہیں بے پناہ عبور حاصل تھا مگر ان کا کوئی ایک بھی ایسا افسانہ پیش نہیں کیا جا سکتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی زبان دانی پر اترا رہی ہیں۔ ان کے ہاں نہ محاورے بازی ہے اور نہ فقرے بازی ہے۔ وہ جس طرح اپنی زندگی میں غیر ضروری آرائش و زیبائش کی عادی نہیں تھیں، اسی طرح اپنے فن کو بھی سلمے ستارے، رنگ رنگ کے فیتوں اور قسم قسم کی گھنگھریوں سے آراستہ نہیں کرتی تھیں۔ عام زندگی میں ان کی سادگی اور انسانی رشتوں کے معاملے میں ان کی سادہ دلی ان کے ادب میں یوں نمایاں ہوتی ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے بے حد گہرے مسائل کو نہایت آسان اور بے انتہا سلیس جملوں میں بیان کرتی چلی جاتی تھیں۔ ان کا انداز تحریر ایک ایسی نرم رو ندی کا تھا جس کا کام شور مچانا نہیں ہے، صرف بہنا اور شاداب کرنا ہے۔ یہ ندی جب مسائل کے پہاڑوں میں سے بھی گزرتی تو کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرتی تھی، پتھروں سے الجھ کر بس ذرا سا گنگنا لیتی تھی۔ دراصل خدیجہ کو اس بات کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وہ زبان کے چٹخارے کی مدد سے اپنی کہانیوں کو سرخی پاؤڈر لگاتی پھریں۔ یہ زبان کا چٹخارہ کوئی معمولی ترغیب نہیں ہے۔ عصمت چغتائی کی سی اعلیٰ پائے کی افسانہ نگار بھی اس کمزوری سے نہیں بچ سکیں اور اپنے بیشتر افسانوں میں زبان دانی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہیں مگر خدیجہ کو بننے کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ نمائش سے وہ کتراتی تھیں، ہیر پھیر سے انہیں نفرت تھی۔ عام زندگی کی طرح افسانوں میں بھی وہ دوٹوک بات کرنے کی عادی تھیں۔ ان کے ناول ''آنگن'' پر لکھتے ہوئے بعض احباب نے کہا تھا کہ اس ناول کے چند حصے ایسے ہیں کہ اگر خدیجہ چاہتیں تو ان پر محنت کر کے انہیں ادبی لحاظ سے بہتر بنا سکتی تھیں۔ دراصل ہمارے ادب کا قاری سادگی اور سلاست کا عادی نہیں ہے۔ اسے عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ و تراکیب کا اتنا نشہ ہو چکا ہے اور ادب میں جھالروں اور پھندنوں سے اسے اس قدر مانوس بنا ڈالا

گیا ہے کہ وہ سلاست اور سادگی کو ادب کے منافی قرار دینے لگا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ ایک سادہ جملہ لکھنا ایک گرجتے گونجتے پھنکارتے اور دھاڑتے ہوئے جملے کے مقابلے میں کتنا مشکل ہے۔ شاید اسی لیے مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے دوستوں کی اس شکایت کے جواب میں کہ وہ اپنے اخبار میں اتنے لمبے لمبے اداریے کیوں لکھتے ہیں' فرمایا تھا کہ عزیزو! مختصر اداریے لکھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہوتا! میرا خیال ہے کہ اپنے افسانوں اور ناول میں جتنے مختصر جملے خدیجہ نے لکھے اتنے گذشتہ پچاس برس کے اُردو افسانہ نگاروں میں شاید ہی کسی نے لکھے ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدیجہ اپنے افسانوں کو غیر ضروری محاوروں اور ترکیبوں سے شعوری طور پر پاک رکھتی تھیں۔ میرے اس اندازے کا پس منظر یہ ہے کہ خدیجہ میں مزاح اور طنز کی حس غیر معمولی حد تک تیز تھی۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں پر' اکثر اوقات ایسے ایسے فقرے چست کر جاتی تھیں کہ مخاطب کو بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ ان کی یہ حس اتنی شدت کی حد تک تیز تھی کہ بعض ایسے لوگ بھی ان کی تیز دھار زبان کی کاٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے جن کے ساتھ بے تکلفی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خدیجہ نے اپنے عزیزوں اور سہیلیوں کو جو خطوط لکھے ہیں وہ اگر یکجا کر کے چھاپ دیے جائیں تو ایک ایسی خدیجہ سامنے آئیں گی جن کا ہنسنے ہنسانے کے سوا جیسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ اتنے شگفتہ خطوط میری رائے میں غالب کے بعد خدیجہ ہی نے لکھے ہیں۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے لیکن اگر یہ خطوط چھپ گئے تو آپ کو میرے اس دعوے کا ثبوت مل جائے گا۔ مگر جب بھی خدیجہ افسانہ لکھنے بیٹھتی تھیں تو اپنی تمام حیثیتوں کو بھول کر صرف افسانہ نگار بن جاتی تھیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور یہ کمال بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ افسانہ نگار خدیجہ فقرے

باز نہیں تھیں۔ مگر ان کے ذہن میں کوئی نہایت خوبصورت اور تیکھا فقرہ آیا مگر وہ ان کے افسانے کی فضا سے مطابقت نہیں رکھتا تھا تو وہ اسے کمال بے چشمی سے رد کر دیتی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ اس لیے ہے کہ گفتگو کی حد تک خدیجہ کا سا فقرے باز انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ظاہر ہے کہ افسانہ لکھتے ہوئے اس قسم کے کتنے ہی فقرے ان کے ذہن میں آتے ہوں گے مگر کسی بھی فقرے کا حسن انہیں افسانے کے مجموعی تاثر کو گزند پہنچانے کا لالچ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ خدیجہ کا ایثار تھا اور ایثار کی یہ عادت بہت کم افسانہ نگاروں کو ہوتی ہے۔

خدیجہ جس بے ساختگی سے بولتی تھیں، اسی بے ساختگی سے ہنستی بھی تھیں مگر مجال ہے جو وہ اپنے افسانوں کے کرداروں پر ہنسیں۔ یقیناً ہمارے معاشرے میں ایسے کردار بھی ہیں جن کی مذمت کرنے کی بجائے ان پر ذرا سا ہنس کر ہی ان کی شخصیتوں پر سے ملمع اتارا جا سکتا ہے، مگر خدیجہ کے افسانوں کے مرکزی کردار عموماً ایسے ہوتے ہیں جن پر ہمارا مصنوعی معاشرہ ہنستا ہے اور خدیجہ کا اس کھوکھلے معاشرے کے قہقہوں کا ساتھ دینا خارج از بحث تھا۔ وہ ان کرداروں کی ماں، بہن اور بیٹی بن کر افسانے لکھتی تھیں اور مائیں اپنی اولاد پر، اور بہنیں اپنے بھائیوں پر اور بیٹیاں اپنے والدین پر ہنسا نہیں کرتیں۔ وہ تو ان کی خوشی پر خوش ہوتی ہیں مگر یہ خوشیاں اس طبقے میں نہایت محدود، نہایت کمیاب ہیں جن میں سے خدیجہ اپنے افسانوں کے کردار منتخب کرتی تھیں، اس لیے خدیجہ ان پر صرف کڑھ سکتی تھیں اور وہ جب کڑھتی تھیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے کرداروں کے دکھ میں شرکت کرتی ہیں۔ انہیں اپنے کرداروں کے معاشرتی رشتوں کا بہت اچھی طرح علم ہوتا تھا چنانچہ ان کے ہر افسانے کا ہر کردار ہمیشہ اپنے معاشرے کے پس منظر میں نمایاں ہوتا ہے۔ خدیجہ ان کرداروں کی ہر مصیبت، ہر پریشانی کے [illegible] تجزیے سے [illegible] نہیں ہوتی تھیں اور کڑھتی اس بات پر تھیں کہ جو مسائل

ناآسودگی ان کرداروں کے تمام دُکھوں کا منبع ہے' وہ اس معاشرے سے کب ختم ہوگی اور جو طبقاتی تربیت ان کرداروں کو ملتی ہے اور ایک خاص قسم کی ذہنیت مرتب ہو جاتی ہے' اس کا سلسلہ کب ٹوٹے گا۔

اپنے افسانے کے معاملے میں خدیجہ اتنی چاق و چوبند تھیں کہ وہ جو اس بات پر بھی زار زار رو سکتی تھیں کہ ہائے' میں نے کتنی مدت سے کوئی افسانہ نہیں لکھا' اپنے افسانوں میں روتی رُلاتی دکھائی نہیں دیتیں۔ ایک بار وہ کسی ایسی ہی ننھی منی بات پر رو رہی تھیں تو میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ اتنے موٹے موٹے آنسوؤں کا بندوبست کہاں سے کر لیتی ہیں۔ آپ کے آنسوؤں کی جسامت تو انگور کے دانوں کی سی ہے۔ اس پر وہ بے اختیار ہنسنے لگی تھیں۔ روتے میں کھل کر ہنسنے لگنا ان کی ایک دلچسپ عادت تھی مگر اپنے افسانوں میں وہ روتی نہیں تھیں اس لیے ہنستی بھی نہیں تھیں۔ البتہ مجھے ایک بات کا شبہ ہے۔ میں ''موقع کا چشم دید گواہ'' نہیں ہوں اس لیے اپنے اس اندازے کو شبہ کہہ رہا ہوں ورنہ مجھے یقین ہے کہ جب وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کے بارے میں سوچنے یا افسانہ لکھنے بیٹھتی ہوں گی تو آنکھوں سے ان ''انگوروں'' کے ڈھیر لگا دیتی ہوں گی۔ مثلاً میں مان نہیں سکتا کہ انہوں نے ''ہینڈ پمپ'' کی چنی بیگم کے گرد جب افسانے کا تانا بانا بنا ہوگا تو ان کی آنکھیں نم نہ ہوئی ہوں گی۔ میرا یہ شبہ اس لیے بھی درست ہے کہ وہ اپنے اندر کا ابال پہلے ہی سے نکال دیتی ہیں' اس لیے ان کے افسانے اس رقت سے کلیتہً محفوظ رہتے ہیں جو جذبات زدگی کی پیداوار ہوتے ہے اور جو افسانہ نگار کو Detach (عدم وابستہ) نہیں رہنے دیتی۔

فیض احمد فیض نے خدیجہ کے افسانوں کے ایک مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ یادگار فقرہ لکھا تھا کہ خدیجہ---- ''مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ''---- خدیجہ کو یقیناً کشیدہ کاری یعنی جزئیات نگاری کا کمال

حاصل تھا' مگر میرے خیال میں وہ محض کشیدہ کاری نہیں کرتی تھیں۔ وہ مصور بھی تھیں مگر ان کی مصوری عبدالرحمن چغتائی اور استاد اللہ بخش کی مصوری سے مختلف تھی۔ یوں سمجھئے کہ وہ زین العابدین کی سی مصور تھیں کہ ان کے موقلم کی ایک جنبش---- ایک اسٹروک درجنوں رنگوں اور بیسیوں آرائشوں سے زیادہ بلیغ معلوم ہونے لگتی تھیں اور یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ خدیجہ کو زندگی اور فن میں غیر ضروری آرائش و زیبائش سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ انہیں صرف سلیقے سے پیار تھا اور سلیقے سے لگا ہوا ایک خط اپنی زبانِ بے زبانی سے جب بولتا ہے تو اس کی آواز کائنات کے دور دراز گوشوں تک پہنچتی ہے۔

میں خدیجہ کے سادہ سلیس مگر گہرے اور پُرکار ناول ''آنگن'' کو بھی ان کے موقلم کی ایک ایسی ہی بلیغ اسٹروک سمجھتا ہوں۔ ''آنگن'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدیجہ کو تاریخ اور سیاست پر حیران کن عبور حاصل تھا۔ انہیں تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کے نازک سے نازک نشیب و فراز کا کماحقہٗ علم تھا مگر اپنے ناول میں انہوں نے یہ علم اُگلا نہیں ہے' اسے کینوس کے طور پر استعمال کیا ہے۔ افسانوں کی طرح اس ناول میں بھی انہوں نے کہیں علمیت نہیں گانٹھی' کہیں تقریر نہیں کی' کہیں اقتباسات کے انبار جمع نہیں کیے' کہیں اپنے قاری پر یہ کہہ کر مسلط نہیں ہوئیں کہ ہمیں داد دو' ہم نے اپنی تاریخ اور سیاست اور ادب میں سے کیا کچھ پڑھ رکھا ہے---- اس کے باوجود خدیجہ کے برش کی ایک استادانہ اسٹروک نے اُردو ناول نگاری کے سناٹوں کو گونجا دیا۔ دراصل خدیجہ کو کتابیں پڑھنے سے زیادہ زندگی پڑھنے پر فخر تھا۔ کتابیں انہوں نے بے شمار پڑھی تھیں مگر زندگی کو اس سے زیادہ پڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں علمیت پر فن کو ترجیح حاصل ہے۔

یہ تھیں خدیجہ جن کی زندگی میں جو سادگی' پیار اور اپنائیت تھی' وہی ان کے

فن میں بھی تھی' اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے' ان کی شخصیت کی ایک خصوصیت ایسی تھی جسے اپنے فن میں منتقل ہونے سے انہوں نے شاید شعوری طور پر روک رکھا تھا اور وہ ان کی پھبتی تھی' طنز سے بھرا ہوا ان کا کٹیلا فقرہ تھا' اور ساتھ ہی ان کے غیر مختتم قہقہے تھے۔ میں نے ایک محفل میں ان کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا۔ خدیجہ اس محفل میں موجود تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ جب یہ محفل ختم ہوگی تو خدیجہ میری اس تحریر کے بعض حصوں کی ''بقراطیت'' پر قیامت کے فقرے کسیں گی اور اگر میں نے ان فقروں سے بھی زیادہ نوکیلے اور چوٹیلے فقروں سے جواب دینے کی کوشش کی تو وہ سرے سے سنیں گی ہی نہیں کیونکہ وہ فقرہ کہنے کے بعد ہنستی تھیں تو ہنستی ہی چلی جاتی تھیں اور مقابل چاہے گلا پھاڑ پھاڑ کر بھی جواب دے تو وہ سنتی ہی نہیں تھیں کیونکہ وہ ہنسنے میں مصروف ہوتی تھیں---- اور جب ہنس چکتی تھیں تو آنسو پونچھنے بیٹھ جاتی تھیں۔

● ● ●
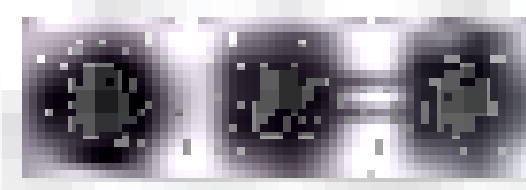
# ابنِ انشا

ابن انشا کی نظم ، انشا کے حسن پر گفتگو کرتے ہوئے تو ، ہی مجھے لگتے ہیں۔ میرے پیش نظر تو انشا کی بعض یادوں کی بازیافت ہے۔ رخصت ہو جانے والے دوستوں کی یادیں ہی تو محبت و رفاقت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان یادوں کی بازیافت کی ہمیشہ سے یہ چھن جانے والے دوست کو عارضی طور پر زندہ کر لینے کی ایک کوشش ہے۔ انشا کی یادیں تو بے شمار ہیں مگر میں آج آپ کو اپنی ان یادوں میں شریک کرنا چاہتا ہوں جن میں انشا کا وجود مجسم تبسم بن کر سامنے آتا ہے۔ انشا کی متبسم شخصیت کی یاد اس کی جدائی کے زخموں کو اور گہرا کر جاتی ہے اور ہم جو اس کی باتوں پر مسکراتے ہیں' اندر ہی اندر روتے ہیں کہ یہ گوہر گراں مایہ ہم سے اتنی جلدی کیوں چھن گیا اور یہ نعمت ہم سے ایک دم کیوں واپس لے لی گئی۔

انشا سے میری شناسائی اس وقت سے تھی جب وہ شیر محمد قیصر تھا۔ خط و کتابت میں ہماری بات چیت بیشتر شاعری کے بارے میں ہوتی تھی اس لیے مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ شیر محمد قیصر کے پردے میں ایک خوب صورت شاعر کے علاوہ ایک بے مثل مزاح نویس' ایک زندہ دل سفرنامہ نگار، ایک محتاط مترجم بچوں کا

ایک محبوب شاعر، ایک وضع دار دوست اور ایک بے لوث انسان بول رہا ہے۔ جب وہ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے لاہور آیا تو میں پشاور ریڈیو سے متعلق تھا۔ پھر جب میں لاہور منتقل ہو گیا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجتماعوں میں اس کا قریبی ساتھ رہا۔ انہی دنوں ابراہیم جلیس حیدر آباد سے لاہور آیا اور مجھ سے ملا تو اس نے انشا کے ہاں جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں ایبٹ روڈ پر شاط سینما کے سامنے اسے انشا کے گھر لے گیا۔ یہ چھوٹا سا گھر چینی طرز تعمیر کا تھا۔ ویسے بھی انشا کے نقوش کچھ چینی سے تھے۔ چنانچہ جب انشا گھر سے باہر آیا تو ابراہیم جلیس نے اسے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا "مہاتما بدھ! تم تو پگوڈا میں رہنے لگے۔" اور انشا بولا "اے ازلی بھکشو! اس پگوڈا کے دروازے تمہارے لیے ایک بھائی کی باہوں کی طرح کھلے ہیں۔"

انشا سے میری ملاقاتیں بیشتر پر تکلف ماحول میں ہوتی تھیں اس لیے مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ بظاہر اس اُداس چہرے کے پیچھے شگفتگی اور زندہ دلی کا ایک سمندر متلاطم ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ دلآویز پہلو مجھ پر بتدریج منکشف ہوا جب تکلف کی دیوار گر گئی اور ہمارے درمیان دو ہم سطح اور ہم مرتبہ دوستوں کی طرح تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ ان دنوں ہمارا معمول تھا کہ ہم انجمن کے اجلاس کے بعد میکلوڈ روڈ کے چوک لکشمی کے ایک ریسٹورنٹ میں اکٹھا ہوتے، اور چائے پیتے۔ بل ادا کرنے کا وقت آتا تو سب حاضرین اس میں شرکت کرتے مگر ایک روز انشا نے بڑے پتے کی ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ بل آتا ہے تو ویٹر کے سامنے ہم ایک ایک آنے کا چندہ جمع کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم ہیں تو فقیر لوگ مگر ریسٹورنٹ کے ویٹروں پر یہ ظاہر کرنا کچھ ایسا ضروری تو نہیں ہے کہ ہم بھی ان کی طرح قلاش ہیں۔ چنانچہ آئندہ ہفتے جب ہم چائے کا آرڈر دیں تو فوراً بعد سب لوگ چپکے سے ایک ایک آنہ میرے پاس جمع کرا

ہو؟" انشا بڑی معصومیت سے بولا "ویسے بھی کوئی اُلجھن کی بات ہے۔ یوں سمجھو کہ شاعر پھولوں کی ایک کیاری میں بیٹھا ہے۔ اس کے پاس شبنم سے بھرا ہوا ایک کٹورا رکھا ہے۔ ہاتھ میں ڈراپر ہے۔ وہ اپنی عینک کو ناک کے آخری سرے پر رکھ کر ڈراپر کی مدد سے کٹورے میں سے شبنم کا ایک قطرہ اٹھاتا ہے اور پھول پر اس احتیاط سے گراتا ہے کہ کہیں وہ پھول کی پتی پر سے ادھر اُدھر ڈھلک نہ جائے۔ اسے کہتے ہیں پھولوں پر انہماک سے شبنم گرانا!"

ایک اور شاعر دوست نے انشا سے مزاج پوچھے تو وہ بولا "ویسے تو ہر طرف خیریت ہے مگر کل سے کھانسی ہو رہی ہے۔" شاعر نے کہا "کوئی بے احتیاطی کی ہوگی۔" انشا بولا "ہاں بے احتیاطی ہی ہوئی۔ اصل میں تمہاری وہ غزل با آوازِ بلند پڑھ بیٹھا جو کل ہی شائع ہوئی ہے۔" شاعر نے پوچھا "میری غزل کا کھانسی سے کیا تعلق؟" انشا نے جواب دیا "غزل کے مضمون کا تو کھانسی سے کوئی تعلق نہیں مگر تمہاری غزل کے قوافی بہت کھانسی آور تھے" ---- اور اس کے بعد انشا نے شاعر کو اس کے قوافی سنائے اور ہر قافیے کے ساتھ کھانستا چلا گیا ---- "تقسیم ہے۔ ترحم ہے ---- توہم ہے ----!"

اسلام آباد میں وزارتِ تعلیمات کے زیرِ انتظام ایک اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ پنجاب میں ایم۔ اے۔ اور ایم۔ ایس۔ سی تک ذریعۂ تعلیم پنجابی ہونا چاہیے۔ انشا پنجابی تھا اور اُردو کی طرح پنجابی کا بھی رسیا تھا مگر صاف صاف کہہ دیا کہ ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی کو فی الحال رہنے دیجیے اور میٹریکولیشن یا انٹر تک اکتفا فرمایئے۔ وہ صاحب بولے "ہم پنجابی زبان کو اتنی ترقی دیں گے کہ اس میں ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی کی بھی تعلیم دی جا سکے گی۔" انشا نے کہا "یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم پنجابی کو پنجابی ہی رہنے دیں اور اس میں جو بھی ترقی ہو بتدریج

ثبوت ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ میں نے فیض صاحب سے متعلق یادوں میں بیان کر دیا ہے۔

اور یہ اس آخری دعوت کا واقعہ ہے جب انشا اپنی بہن کی شادی پر آخری بار لاہور آیا تھا۔ دعوت میں لاہور کی ساری ادبی برادری مدعو تھی۔ انشا کو جس نے بھی دیکھا اس کا جی دھک سے رہ گیا کہ وہ بالکل دھان پان ہو رہا تھا اور اس کا مرض اس کی مسکراہٹوں اور چٹکلوں سے بھی چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ اس کی شگفتہ طبعی صحت کے اس عالم میں بھی اسی طرح توانا تھی۔ وہ دوستوں کی مدارات کے سلسلے میں یہاں سے وہاں گھوم رہا تھا۔ میں کھانا ختم کر چکا تو وہ کھیر کے دو پیالے اٹھائے میرے پاس آیا اور بولا "یہ لیجیے آپ تو مٹھائی کے بڑے رسیا ہیں نا۔" میں نے کہا "انشا جی! میں تو ابھی ابھی کھیر کے دو پیالے صاف کر چکا ہوں۔" اور انشا بولا "ویسے تو میں کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ ابھی ابھی آپ نے کھیر کے ساتویں اور آٹھویں پیالے کی صفائی کی ہے مگر اس نویں دسویں پیالے کا بھی صفایا کر دیجیے کہ ---- صفائی عجب چیز دنیا میں ہے!"

صحت کے اس مخدوش عالم میں بھی انشا کی خوش مزاجی اور حوصلہ مندی کے دو نہایت غیر مبہم ثبوت میں نے "فنون" میں درج کیے تھے۔ ایک تو لندن سے آنے والے اس کے ایک خط کا یہ جملہ مجھے نہیں بھولتا کہ ---- فنون میں میری کتاب پر تبصرہ شائع ہونا چاہیے اور اگر شائع ہو چکا ہے تو ایک اور تبصرہ بھی شائع کر دیجیے کہ بڑی کتابوں پر ایک سے زیادہ تبصروں کی اشاعت میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ پھر میرے نام انشا کا مفصل آخری خط تھا اور ساتھ ہی اس کی زندگی کا آخری مضمون جس میں اس نے ملک الموت کی پسلیوں میں بھی ٹہوکے دیے تھے۔ یہ تھا روحانی گہما گہمی اور زندہ دلی سے چھلکتا ہوا انشا جس کی برسی مناتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود زندگی کی برسی منا رہے ہیں۔

نظاموں کا غیر مشروط دشمن تھا جو عامۃ الناس کو گھٹیا اور بڑھیا انسانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور جنہیں یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے---- اور یہ تکلیف انہیں سینکڑوں صدیوں سے ہو رہی ہے --- کہ عام انسانوں کی آنکھیں بھی ان کی آنکھوں کی طرح تعداد میں دو کیوں ہیں، ایک کیوں نہیں ہے---- اور اگر دو آنکھوں کے بغیر چارہ نہیں تھا تو ان کی وہ ذہنیں کیوں جڑ گئی ہیں جو تفریق و امتیاز کے لیے ضروری تھیں، اور یہ چوپایوں کی طرح پچھلی دو ٹانگوں کے علاوہ اگلے دو ہاتھوں کو بھی زمین پر ٹیک کر کیوں نہیں چلتے۔ ابن انشا صرف اس طرح کی سوچ رکھنے والے "نسلی" انسانوں کا دشمن تھا، ورنہ اس کی شخصیت میں اتنی نرمی تھی، اتنا درد تھا، اتنی اپنائیت تھی کہ میں تو اس سے جب بھی ملا مجھے مہاتما بدھ یاد آ گئے۔ ایسے کھرے اور بے ضرر انسان کو بھی تیس چالیس برس اور زندہ رہنا چاہیے تھا۔

ابن انشا کے سے وجود ہی تو انسانی زندگی کو پُرمایہ اور تہہ دار بناتے ہیں اور انسانوں کو زندہ رہنا اور سلیقے سے زندگی گزارنا سکھاتے ہیں۔ مگر وہ جن کی پوری میعادِ حیات، انسانی زندگی کو حسن و خیر اور شگفتگی و بے ساختگی کے ساتھ بسر کرنے کی ایک تبلیغ مجسم ہوتی ہے جب خود مر جاتے ہیں، چاہے ابن انشا کی طرح جیتے جیتے مر گئے ہوں، اپنے عزیزوں اور دوستوں اور پڑھنے والوں اور یاد کرنے والوں کے لیے زندگی کو ایک کربِ مسلسل میں بدل جاتے ہیں اور ہم آس پاس بکھرے ہوئے اندھیروں کو ٹٹولتے رہ جاتے ہیں کہ یہ جو ابھی ایک کوندا سا لپکا تھا، وہ تاریکی کے اس انبار میں کہاں کھو گیا۔

ابن انشا کی شخصیت اور ذہنیت کے تجزیے کیے جا رہے ہیں۔۔ جو ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا تھا، فطرت سے کتنا کھلا تھا اور وہ جس نے شوخی اور طنز میں بھی ایک ایسا اسلوب تراش لیا تھا، داخلی طور پر کتنی محرومیوں کا شکار تھا۔ مگر مجھے ان

# سجاد سرور نیازی

ابھی چند ہفتے پہلے میں لاہور ٹیلی ویژن اسٹیشن کے ایک کمرے میں سے گزر تو آواز آئی "ندیم" پلٹ کر دیکھا تو ایک کرسی پر سجاد سرور نیازی بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ سالہا سال کے خاندانی روابط کی وجہ سے ان کی حیثیت میرے بڑے بھائی کی سی تھی۔ ہم انھیں "سرور بھائی" کہا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگایا اور شکایت کی کہ لاہور میں رہتے ہوئے' میں ان سے نہیں ملتا۔ میں نے اپنی بے ہنگم مصروفیتوں اور ٹرانسپورٹ کی مشکلوں کا عذر تراشا تو بولے۔ "اچھا تو ہم سب تمھارے ہاں آئیں گے۔ پھر تم سب کو اپنے ہاں لے جائیں گے۔ زندگی کی مہلت بہت مختصر ہے ندیم' اسے ضائع نہیں جانے دینا چاہیے اور اسے کام میں لانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے پیاروں سے روابط قائم رکھیں۔ میں بھی قصوروار ہوں' تم بھی قصوروار ہو مگر تم زیادہ قصوروار ہو کیونکہ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔"

میں نے اعترافِ جرم کیا اور پھر ان کے مشاغل کا پوچھا تو بولے "یہ دیکھو۔ بظاہر میں علمِ موسیقی پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں' مگر دراصل یہ موسیقی کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ تم مجھے اپنا رسالہ نہیں بھیجتے مگر میں پڑھ لیتا ہوں۔ اس میں تم موسیقی پر بھی مضامین چھاپتے ہو' اس لیے تمھیں کچھ شُد بُد تو ہوگی۔ اور یہ تو میں

لے گئے جہاں ایک کمرہ میرے لیے وقف کر دیا گیا اور میں ان کے گھرانے کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ بڑی منتوں اور التجاؤں کے بعد انھوں نے مجھے الگ رہنے کی اجازت دی مگر چند ہفتے گزرے تو وہ مجھے پھر سے یہاں اٹھا لائے۔ یوں تقریباً ڈیڑھ برس کے قیام کے دوران ایک برس تک میں ان کے ہاں رہا۔ ہم اکٹھا کھانا کھاتے تھے، اکٹھا ریڈیو اسٹیشن جاتے تھے، اکٹھے واپس آتے تھے۔ اس عرصے میں مجھے سرور بھائی کی شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ یہ شخص تمام و کمال آرٹسٹ ہے۔ وہ اتنا سادہ اتنا معصوم اور دنیاداری سے اتنا بلند ہے کہ یقین نہیں آتا وہ اسٹیشن ڈائریکٹر بھی ہے۔ اس کی گھریلو زندگی مبالغے کی حد تک پرسکون ہے مگر اس کے اندر جو فن کار ہے وہ اسے بے چین رکھتا ہے چنانچہ کبھی وہ ستار بجا رہا ہوتا ہے، کبھی وریا پر مشق کر رہا ہوتا ہے، کبھی اس کے سامنے طبلے کی جوڑی رکھی ہوتی ہے۔ پھر کبھی وہ ایزل پر کینوس رکھے تصویر بنا رہا ہوتا ہے، کبھی میرے ساتھ علم موسیقی اور علم عروض پر بحث کر رہا ہوتا ہے۔

۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کو جب رات کے بارہ بجے آل انڈیا ریڈیو کو پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس میں بدلنا تھا تو پشاور ریڈیو اسٹیشن کا سارا اسٹاف اسٹیشن میں جمع تھا۔ سٹاف کے ایک رکن شوکت نے عمارت کی چھت پر چڑھ کر ریوالور سے چند ہوائی فائر کر کے آزاد پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ سرور بھائی نے سبز ہلالی پرچم لہرایا اور اس کے بعد ایک گھنٹے کا وہ ریڈیو پروگرام شروع ہوا جو میری زندگی کی چند لطیف یادوں میں سے ایک عزیز ترین یاد ہے۔ آزادی، قیام پاکستان اور قائد اعظم کی عظیم رہنمائی کے موضوعات پر کئی ترانے لکھے گئے، سبھی کی دھنیں سرور بھائی نے ترتیب دیں اور ان میں سے پہلا ترانہ خود سرور بھائی نے گایا۔ یوں مجھے پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ سرور بھائی کا

نے اسلم کو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا مگر اسلم نے معذرت کر لی اور کہا "میں پچھلی سیٹ پر تو بالکل نہیں بیٹھوں گا۔ کار اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ میں ڈرتا ہوں جیسے کوئی کھڈ آ گیا تو وہ حصہ جس میں آپ اور ندیم بیٹھے ہیں پچھلے حصے سے کٹ کر الگ ہو جائے۔ آپ آدھی کار میں بیٹھے ریڈیو اسٹیشن جا پہنچیں گے اور میں پچھلے حصے سمیت ہی سڑک پر پڑا رہ جاؤں گا۔ اس کار ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرور بھائی سماجی مرتبے کے نمائشی اظہار سے کتنے بے نیاز تھے۔

سادگی ان کے مزاج کا نمایاں ترین جوہر تھی اور پھر وہ اس انتہا کے حساس تھے کہ ایک بار جب ہم لوگ گھر کے اندر کسی فنی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے سرور بھائی کی بچیاں دیوار کے ساتھ اپنی گڑیاں سجا کے بیٹھی تھیں۔ یکایک گڑیوں کی شادی کے مسئلے میں وہ آپس میں الجھ پڑیں۔ سرور بھائی نے انھیں روکا مگر جب ان کا جھگڑا جاری رہا (آخر رشتے کا جھگڑا تھا) تو سرور بھائی کے اندر کا پٹھان جاگا۔ انھوں نے دہکتی ہوئی استری اٹھائی اور بچیوں کے ان ٹین کے بکسوں پر جن میں ان کی گڑیاں بھی رہتی تھیں استری کی اتنی بے تحاشا ضربیں لگائیں کہ سب پچک گئے اور خود سرور بھائی بھی اپنے ہاتھ کو زخمی کر بیٹھے۔

اس کے برعکس دوسری انتہا ملاحظہ ہو کہ ایک بار میرے ایک ملازم (غلام محمد) نے مجھے بتایا کہ اس سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور سرور بھائی اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیتے۔ اس نے کہا کہ میری سفارش کیجیے اور معافی دلوا دیجیے۔ میں سرور بھائی کے مزاج سے واقف تھا اس لیے غلام محمد کو ہدایت کی کہ وہ خود جا کر معافی مانگ لے اور اگر ایسا کرتے ہوئے وہ آنکھوں سے دو آنسو نہیں گرا سکتا تو کم سے کم اس کی آواز ضرور بھرا جانے۔ غلام محمد نے ایسا ہی کیا۔ اس نے سلام کیا تو اسے کوئی جواب نہ ملا۔ بھرائی ہوئی آواز میں معافی مانگی تو سرور بھائی چونک کر اٹھے اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا اور بولے "کوئی بات نہیں غلام محمد

صاحب اتنے دبلے پتلے تھے کہ محسوس ہوتا تھا' ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو ان کے قدم اکھڑ جائیں گے۔ وہ ہمیشہ شلوار قمیص میں ملبوس رہتے تھے اور اگر اس سے ۲۰ برس پہلے منٹو اور کرشن چندر نے دہلی میں مجھے کوٹ پتلون پہننا اور ٹائی باندھنا سکھا نہ دیا ہوتا تو میں بھی انہیں شلوار قمیص میں ہی ہوں ملتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان دنوں میں خاصا تندرست نوجوان تھا۔ میرے بازوؤں میں مچھلیاں تھیں اور میری ٹھوڑی دوہری تھی۔ یوں سمجھیے کہ اُن دنوں میری صحت بالکل ویسی تھی جیسی انتقال سے چند برس پہلے طفیل صاحب کی صحت تھی اور رُبع صدی پہلے طفیل صاحب بالکل ایسے ہی دبلے پتلے تھے جیسے ان دنوں میں ہوں۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ طفیل صاحب نے میری صحت مجھ سے چھین لی' اس لیے کہ صحت کا انحصار موٹاپے اور دبلاپے پر نہیں ہوتا۔ میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہم دونوں میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں--- جسمانی لحاظ سے بھی اور نظریاتی و جذباتی لحاظ سے بھی۔ اگر کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو وہ طفیل صاحب کی اور میری دوستی کا رشتہ تھا جو کئی بار طنبورے کے تار کی طرح تن گیا مگر ٹوٹا ایک بار بھی نہیں کہ اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہی ختم ہو چکا تھا۔

میں نے طفیل صاحب کو اپنے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''کیسر کیاری'' پیش کر دیا۔ یہ نام میرے استادِ گرامی حضرت مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے منتخب کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ ''زعفران زار'' کا اس سے بہتر اردو ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ (یہ مجموعہ میرے ابتدائی مزاحیہ مضامین اور بعض تراجم پر مشتمل تھا۔ البتہ ابھی دو چار برس پہلے میں نے اپنے مزاحیہ کالموں کا انتخاب اسی نام سے شائع کر دیا اور یوں میرا وہ ابتدائی مجموعہ پس منظر میں چلا گیا)۔ جس ادارے نے میری یہ کتاب شائع کی تھی اس کا نام مکتبۂ شعر و ادب یا اسی طرح کا کوئی نام تھا' بہرحال ادارۂ فروغ اردو نہیں تھا۔ طفیل صاحب نے یہ ادارہ بعد میں قائم کیا اور اس ادارے میں کوئی

ے صاحب ان کے شریک کار نہیں تھے۔ میں نے چند برس بعد دارالاشاعت کے متذکرہ دو ہفت روزوں کے علاوہ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' کی ادارت بھی سنبھال لی اور ۱۹۴۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران طفیل صاحب سے قریب قریب روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ میں اندرون بھاٹی دروازہ میں کئی بار ان کے آبائی مکان میں بھی گیا۔ وہ گھر تو بہت مختصر سا تھا مگر اس کے مکین بڑے فراخ دل اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ میں نے وہاں کتنی ہی شامیں اس گھر کے ایک فرد کی طرح گزاریں اور طفیل صاحب کے علاوہ ان کے بزرگوں اور بھائیوں کی محبتیں وصول کرتا رہا۔

''تیسرا پہر'' کے بعد انھوں نے میرے متعدد مجموعے ---- ''رم جھم'' اور ''آنچل'' اور ''آبلے'' اور ''بازارِ حیات'' شائع کیے مگر میرے ناشرین میں سے یہ واحد ناشر ہیں کہ جس طرح وہ میرے پہلے مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں میری توقعات پر صد فی صد پورے اترے اسی طرح دوسرے مجموعے کے سلسلے میں بھی انھوں نے اپنے خلوص و دیانت کا معیار برقرار رکھا اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ایک مصنف اگر یہ کہتا ہے کہ اسے فلاں ناشر سے تمام عمر کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تو یہ معمولی بات نہیں ہے۔ آج کل خود میں ایک چھوٹا سا ناشر ہوں اور ہزار احتیاط کے باوجود ان خواتین و حضرات کی بعض شکایت کا ہدف بنتا رہتا ہوں جن کے مجموعے میں نے شائع کیے ہیں۔

میں ۱۹۴۵ء میں اعصابی تھکن کا شکار ہو کر گاؤں چلا گیا تو جب بھی طفیل صاحب مجھے اپنے خوب صورت خطوں کے ذریعے دلاسے دیتے رہے۔ صحت یاب ہو کر میں آل انڈیا ریڈیو پشاور سے بحیثیت مسودہ نویس وابستہ ہو گیا اور ۱۹۴۶ء میں پشاور منتقل ہو گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد چودھری نذیر احمد نے رسالہ ''سویرا'' جاری کرنے کا اہتمام کیا اور پشاور آکر اس کی ادارت میرے سپرد کر گئے۔

''سویرا'' کے ابتدائی تین شمارے میں نے ہی مرتب کیے۔ یہ سلسلہ شاید جاری رہتا اگر میں مستقل طور پر لاہور منتقل نہ ہوتا۔

جب بہن خدیجہ مستور اور بہن ہاجرہ مسرور لکھنؤ میں تھیں اور بعد میں بمبئی چلی گئی تھیں تو ''ادبِ لطیف'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط و کتابت رہی۔ پھر یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ ہم لوگ بھائی بہن کے رشتے میں منسلک ہوگئے۔ چنانچہ جب قیامِ پاکستان کے بعد ان بہنوں کا خاندان ہجرت کر کے لکھنؤ سے بمبئی ہوتا ہوا پہلے کراچی اور پھر لاہور آیا تو مجھے طفیل صاحب ہی نے لاہور میں ان کی آمد کی اطلاع دی۔ میں پشاور سے لاہور پہنچا تو طفیل صاحب ہی مجھے نسبت روڈ کے اس مکان پر لے گئے جہاں میں بعد میں سوا برس تک اپنے اہلِ خانہ سمیت مقیم رہا اور جو اب مشہور شاعر خالد احمد کی ملکیت ہے۔ انہی دنوں طفیل صاحب نے اِس شرط کے ساتھ ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ اس کی ادارت بہرصورت مجھے اور میری ادیب بہنوں میں سے کسی ایک کو سنبھالنی تھی۔ میں نے رسالے کا نام ''نقوش'' تجویز کیا۔ طفیل صاحب کو اس کا ڈیکلریشن بھی مل گیا۔ ہاجرہ بہن اور میں اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ ہم تینوں کا مشترکہ رسالہ تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ ہم دونوں اپنی ایک ایک کتاب طفیل صاحب کے اشاعتی ادارے کی نذر کر دیں گے اور ان کا معاوضہ رسالے کے دو حصے شمار ہوگا۔ تیسرے حصے کی ملکیت طفیل صاحب کی ہوگی۔ وہی رسالے میں سرمایہ لگائیں گے اور رسالے کے مہتمم یا منیجر ہوں گے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ''نقوش'' کا پہلا شمارہ ''زوبی'' کے سرورق کے ساتھ افقِ ادب پر طلوع ہوا تو صائب الرائے اصحاب نے غیر مشروط طور پر اعلان کر دیا کہ ''نقوش'' پاکستان کے اُردو شعر و ادب کی ترجمانی کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرے گا۔ اس لیے میں نے اس کی پیشانی پر ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' کے الفاظ درج کیے تھے۔

پولیس کی مسلسل دھمکیاں اور پوچھ گچھ کا لامتناہی سلسلہ اب ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے اس لیے رسالے کو موجودہ صورت میں جاری رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔ جب ''نقوش'' کا دسواں شمارہ شائع ہوا تو طفیل صاحب نے محسوس کیا کہ یہ وقت تو شاید کٹھنیاں جھیل کر آئے ہیں اور ان کی شدت کا ساتھ ناممکن ہو چلا ہے۔ ہم لوگ روپے پیسے سے محروم تھے۔ ہمارے پاس تو صرف ایک ہی دولت تھی اور وہ ہمارا قلم تھا۔ اتفاق سے اس وقت ہاجرہ بہن گھر میں موجود نہ تھیں ورنہ جارحانہ بحث مباحثے کا ایک طویل دور شروع ہو سکتا تھا۔ طفیل صاحب کی سیاسی بے بسی اور ان کی اقتصادی بے بسی کا تقاضا یہی تھا کہ اس اشتراک کو ختم کر دیا جائے۔ میں اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں جا کر معاہدے کی وہ نقل اٹھا لایا جو ''نقوش'' کی ملکیت کے اشتراک سے متعلق تھی۔ پھر میں نے طفیل صاحب کے سامنے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور عرض کیا کہ آپ بھی مجبور ہیں ہم بھی مجبور ہیں۔ مگر انسانی سطح پر ہمارے تعلقات میں کوئی رخنہ نہیں پڑنا چاہیے۔ طفیل صاحب کے خیالات بھی ایسے ہی تھے چنانچہ اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ بعد میں جب ہاجرہ بہن گھر آئیں اور میں نے انھیں اس حادثے کی اطلاع دی تو وہ اس حد تک آزردہ ہوئیں جیسے ہمارے کسی پیارے عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر طفیل صاحب کے پاس بھی گئیں اور وہاں دل کی بھڑاس نکالی۔ مگر ہماری طرح ان کے سامنے بھی اشتراکِ عمل کا کوئی فارمولا نہ تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے ہماری کومٹمنٹ اٹل تھی اس لیے کسی سمجھوتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بعد میں ''نقوش'' سید وقار عظیم کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ ہمارے زخم تازہ تھے اس لیے ''نقوش'' کی چند اشاعتیں ہماری تحریروں سے خالی رہیں مگر کچھ عرصہ بعد ہم دونوں نے ''نقوش'' میں مسلسل لکھا اور آخر تک لکھتے رہے۔ اس

کے مدیر کے اندر تو یہ خصوصیت ہونی چاہیے اور وہ خصوصیت ہونی
چاہیے اور اپنے طفیل صاحب تو سیدھے سادے شرمیلے شرمیلے بجائے
بجائے سے نوجوان ہیں جو اچھے شعر کی داد بھی یوں دیتے ہیں جیسے ڈر
سے کراہ رہے ہوں۔ مگر جب "نقوش" کے بھاری بھر کم شمارے آنے
لگے تو مندرجات کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ طفیل صاحب میں ایک
عمدہ مدیر کی متعدد خوبیاں موجود ہیں۔ انھیں ادبی تخلیقات کو پرکھنا آتا
ہے اور ان کے پاس شعر و افسانہ اور تنقید، تحقیق کی معیاری کسوٹیاں
موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے ادیب ہونے کا ثبوت
یوں فراہم کر دیا کہ چند ہم عصر ادیبوں کے خاکوں پر مشتمل ان کا ایک
مجموعہ "صاحب" کے نام سے شائع ہو گیا . . . طفیل صاحب نے
خاکہ نگاری کا ایک اپنا اسلوب وضع کیا اور اس میدان میں بھی بڑے
بڑوں سے اپنی انفرادیت تسلیم کرا لی اور پھر "نقوش" کے نمبروں کا
سیلاب آ گیا . . . میں سوچتا ہوں اگر میں ۱۹۴۹ء کے بعد بھی
"نقوش" کا مدیر رہتا اور طفیل صاحب مجھ سے (اپنے بے شمار مرتب
کردہ نمبروں میں سے) کوئی ایک بھی نمبر مرتب کرنے کی فرمائش
کرتے تو میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ بھاگتا یوں کہ میرے معیاروں کے
مطابق ذاتی لحاظ سے میری کمٹمنٹ صرف تخلیقی ادب سے ہے اور وہ
بھی بیشتر معاصر تخلیقی ادب سے۔ پھر "نقوش" کے سے تحقیقی نمبر مرتب
کرنے کے لیے جس جانفشانی اور دقیق نشست استقامت اور تلاش و
جستجو اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے اور طفیل صاحب کے ہاں بدرجہ اتم
موجود تھی اور ایسی تحقیق سے مجھے بہت گہرا شغف ہے میں اس کی تحسین
کرتا ہوں مگر اس سے بدکتا بھی ہوں۔ طفیل صاحب نے "نقوش" کے

کا ہر کم تعداد میں درج ہوئے ہیں اور میں اسی لیے ان پر حملہ آور ہو رہا ہوں۔ اسی نمبر
میرے کالموں کا ایک معقول انتخاب اس نمبر میں شامل تھا اور میرے ذہن میں
اس امر کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس واقعے کے بعد چند ماہ تک ہمارے درمیان
بالمشافہ ملاقات یا خط یا ٹیلی فون تک کے ذریعے بھی کوئی رابطہ نہ رہا۔ پھر بابائے اردو
مولوی عبدالحق لاہور تشریف لائے تو میں اور ہفت روزہ "لیل و نہار" کے مدیر
سید سبط حسن اُن کے استقبال کے لیے لاہور اسٹیشن پہنچے۔ وہاں طفیل صاحب بھی
موجود تھے۔ مصافحہ ہوا اور طرفین کے گلے شکوے کچھ کہے سنے بغیر دور ہو گئے۔

بعض عناصر جب بھی "نقوش" کے کسی نمبر یا طفیل صاحب کی کسی
تصنیف کے بارے میں اظہار رائے کریں گے تو اس بات کا حوالہ ضرور دیں گے
کہ طفیل صاحب نے تو کسی زمانے میں کتابت بھی کی ہے۔ بزعم خویش وہ اس
طرح طفیل صاحب کی تضحیک کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ اس طرح تو وہ اس
شخص کی محنت، لگن اور استقامت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اگر طفیل صاحب
نے کسی زمانے میں کتابت بھی کی ہے تو کون سا چھوٹا کام کیا ہے؟ کتابت تو ایک
معزز اور محترم فن ہے اور مسلمانوں کے سرمایۂ فن میں تو کتابت کے شاہکاروں کا
بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ تو وہ فن ہے جسے بادشاہوں تک نے اختیار کرنے میں عزت
محسوس کی اور ابھی ایک صدی پہلے تک کوئی شخص اُس وقت تک صحیح معنوں میں
پڑھا لکھا نہیں کہلا سکتا تھا، جب تک وہ دوسرے فنون کے علاوہ کتابت پر بھی
حاوی نہیں ہوتا تھا۔ پھر اگر یہ فن محض اس لیے حقیر ہے کہ اس سے متعلق فن کار
مالی لحاظ سے عموماً آسودہ نہیں ہوتے تو پھر فن شاعری بھی قابل مذمت ٹھہرتا ہے
کہ اس سے تو کتابت جتنی آمدنی بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اور پھر ہم میں سے بیشتر
ایسے ہیں جن کے اجداد سپاہی تھے یا پٹواری تھے یا اسکول ٹیچر تھے یا نمک مرچ
بیچنے والے دکاندار تھے۔ خود میرے اجداد کسان تھے اور کڑکتی دھوپ میں ہل

لے دے ہوئی۔ مگر میں نے کراچی کے روزنامہ ''حریت'' میں متعلقہ نقاد صاحب کا باقاعدہ دفاع کیا اور لکھا کہ ہجرت کے فوراً بعد کسی ایک آدھ واقعے سے انھوں نے اہلِ پنجاب کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا ہوگا ورنہ وہ تو سالہا سال سے پنجاب میں مقیم ہیں اور ان کے حلقۂ احباب میں پنجاب میں رہنے والے ہم بے شمار اہلِ قلم شامل ہیں۔ یوں یہ طوفان بہت حد تک رک گیا۔ اس واقعے سے متعلق ایک خوشگوار یاد یہ بھی ہے کہ 'نقوش'' میں ان خطوط کی اشاعت کو رکوانے اور ''حریت'' میں میری طرف سے نقاد صاحب کے دفاع سے متاثر ہو کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے برادرِ اکبر قبلہ ابوالخیر مودودی صاحب ہر جگہ میری اتنی بھرپور تعریف کرتے تھے جس کا میں اس حد تک حقدار نہ تھا۔

ایک اور واقعہ ہمارے ایک مشترکہ دوست کا ہے۔ ان کا نام مولانا عبدالسلام ندوی تھا۔ کوہاٹ کے پٹھان تھے اور خان عبدالغفار خان کے معتقد تھے۔ طفیل صاحب نے جب کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا اور ساتھ ہی ''نقوش'' کی تعداد اشاعت میں اضافہ ہوا تو مولانا عبدالسلام ان کے دستِ راست ثابت ہوئے۔ دوڑ بھاگ کا ہر کام ان کے سپرد تھا اور وہ یہ کام اتنی لگن کے ساتھ کرتے تھے جیسے عبادت کر رہے ہیں۔ طفیل صاحب کو عمر بھر مولانا کے ل بے لوث تعاون کا پاس رہا۔ بعد میں مولانا انارکلی میں ایک ادارے ضیاء الدین لمیٹڈ سے منسلک ہوگئے۔ اس ادارے کا دفتر انارکلی میں ''فنون'' کے سابقہ دفتر کے امنے تھا چنانچہ مولانا سے روزانہ میری ملاقات رہتی تھی۔ وہ خلوصِ نیت اور بے غرض محبت کی خوبصورت تجسیم تھے۔ ''فنون'' کی کتابت اور طباعت سے لے راس کی ترسیل تک کے مراحل کو انھوں نے یوں سنبھال رکھا تھا کہ میں اس رف سے قطعی طور پر بے فکر ہوگیا تھا۔ آخری عمر میں وہ شدید بلڈ پریشر کے سبتلا ہوگئے۔ آخر انھیں یو۔سی۔ایچ۔ میں داخل کرایا گیا۔ افاقہ ہوا اور انھیں

ہسپتال سے فارغ کیا جانے لگا تو میں خاصی رقم کا بندوبست کر کے ہسپتال پہنچا تا کہ ہسپتال کا بل ادا کر سکوں۔ اتنے میں طفیل صاحب بھی تشریف لے آئے اور مجھے الگ لے جا کر کہا۔ ''اگرچہ مولانا بعض وجوہ کی بنا پر مجھ سے کچھ روٹھے رہتے ہیں مگر مجھ پر ان کے بہت سے حقوق ہیں اور ہسپتال کا بل میں ادا کروں گا!'' میں نے اپنی جیب سے وہ رقم نکال کر دکھائی جو میں یہ بل ادا کرنے کے لیے لایا تھا۔ پھر عرض کیا ''چلیے یوں کرتے ہیں بل کی آدھی رقم آپ ادا کر دیجیے' آدھی ادا کرنے کی مجھے اجازت دیجیے۔'' مگر طفیل صاحب بضد رہے کہ وہ ساری رقم خود ادا کریں گے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اب طفیل صاحب اشاعتی دنیا کی ایک خوشحال شخصیت تھے اور وہ مولانا کو بآسانی نظر انداز بھی کر سکتے تھے مگر ان کا ضمیر زندہ تھا چنانچہ مولانا کی یہ ننھی سی خدمت کر کے انھوں نے بڑی روحانی آسودگی محسوس کی۔

میں نے ۱۹۶۳ء میں ''فنون'' جاری کیا تو میرے پاس آئے اور کہا ''یہ آپ نے کوئی الگ رسالہ نہیں نکالا ''نقوش'' اور ''فنون'' طفیل اور ندیم کی طرح دو بھائی ہیں اور جس طرح ہم دونوں نے زندگی کے نشیب و فراز میں رفاقت کا حق ادا کیا ہے' اسی طرح ''نقوش'' اور ''فنون'' بھی ادب کی دنیا کے مثالی رفقائے کار ثابت ہوں گے۔'' اور طفیل صاحب نے ''فنون'' کی تعمیر میں میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔

مجھے دکھ ہے کہ میں ان کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا۔ انتقال سے چند ماہ پہلے ایک جگہ ملاقات ہوئی تو بولے ''آپ کسی روز ''نقوش'' کے دفتر تشریف لائیے نا! اب اس کا دفتر نقوش پریس کی اوپر کی منزل میں منتقل ہو گیا ہے جہاں نیو مسلم ٹاؤن میں منتقل ہونے سے پہلے میں اپنے بال بچوں کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ دراصل میں آپ کو اس کرسی پر بٹھا کر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں آپ مجھے بٹھا

گئے تھے!"---- میں ان کے اس بالواسطہ اظہارِ محبت اور اعترافِ رفاقت سے بے حد متاثر ہوا اور وعدہ کیا کہ کسی روز ضرور آؤں گا۔ انتقال سے چند ہی روز پہلے انھوں نے ایک تقریب میں پھر سے یہی فرمائش کی اور میں نے پھر سے وعدہ کر لیا مگر ارادے کے باوجود یہ وعدہ پورا نہ کر سکا اور وہ وعدوں کے پورا ہونے یا نہ ہونے کی اُلجھنوں سے آزاد ہو گئے۔

***